# تمہید

## حرفِ اوّل

زیرِ نظر کتابچہ المورد اسلامک ٹرسٹ کے سرپرست‘ ماہنامہ اشراق کے مدیر اور ’آج‘ ٹی وی کے نامور سکالر علامہ جاوید احمد غامدی کے بعض اہم اصول دین کے علمی‘ تحقیقی اور تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے۔ فاضل مؤلف حافظ زبیر احمد عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ تنظیم اسلامی کے متحرک کارکن بھی ہیں اور مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے شعبہ تحقیق سے منسلک ہیں۔ اس کتابچے کے باب اوّل اور دوم کے مضامین ایک علمی مجلّے ماہنامہ ’’الشریعہ‘‘ میں ایک علمی مناقشہ کے تناظر میں شائع ہو چکے ہیں۔ مذکورہ مجلّے کی ادارتی پالیسی کے سبب باب اوّل کے مضمون کی تفصیلی کتر و بیونت کر دی گئی تھی جس سے بہت سے اہم دلائل اور مباحث سامنے آنے سے رہ گئے تھے۔ اس کتابچے میں وہ مضمون معمولی حک و اضافے کے ساتھ اپنی اصلی شکل میں شامل کیا گیا ہے۔ تیسرے باب کا مضمون بھی اسی مجلّے میں برائے اشاعت بھیجا گیا ہے‘ (لیکن تا حال اس کی اشاعت نہیں ہو سکی اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکا ہے کہ وہ شائع کیا بھی جائے گا یا نہیں)۔

علامہ غامدی کے فکری تفردات اور تجدد پسندانہ نظریات آج کل علمی حلقوں میں بحث و نزاع کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اسلام کے روشن خیال‘ اعتدال پسند اور جدید ایڈیشن کو چونکہ یہ نظریات بہت اپیل کرتے ہیں اس لیے علامہ صاحب کو ایسے حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ ان حالات کا نوٹس لیتے ہوئے دینی حلقوں میں تقریباً ہر طرف سے ان کے افکار کے خلاف تنقیدی مضامین لکھے گئے ہیں۔ لیکن حافظ زبیر صاحب کے یہ مضامین اس لحاظ سے سب سے منفرد ہیں کہ ان میں ان اصولوں سے بحث کی گئی ہے جن پر علامہ صاحب کے متجددانہ نظریات کی اساس ہے۔ گویا جن شاخوں پر اسلام کے اس جدید ایڈیشن کا آشیانہ تعمیر کیا گیا ہے‘ حافظ صاحب موصوف نے اس کی جڑوں پر تیشہ رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ حافظ صاحب کی کاوش کو شرفِ قبول عطا فرمائے‘ آمین!

# مقدمہ

'الشریعۃ' کے جنوری کے شمارے میں ڈاکٹر محمد امین صاحب کے غامدی صاحب پر لکھے جانے والے تنقیدی مضمون کے جواب میں غامدی صاحب کی تائید میں لکھے جانے والے دو خطوط نظروں سے گزرے' ان میں سے ایک خط المورد کے ریسرچ ایسوسی ایٹ اور غامدی صاحب کے شاگرد خاص جناب طالب محسن صاحب کا تھا۔ اپنے اس خط میں جناب طالب محسن صاحب' غامدی صاحب کے ناقدین کے بارے میں لکھتے ہیں کہ غامدی صاحب پر کی جانے والی تنقیدیں عام طور پر طعن و تشنیع اور تضحیک و استہزاء پر مبنی ہوتی ہیں اور صاحب تنقید اپنے لئے قلمی جہاد کا جواز فراہم کرتے ہوئے نوک قلم سے اپنے ہی علم و تقوی کا خون کر ڈالتا ہے۔ غامدی صاحب کے ناقدین کے لیے طالب محسن کی یہ نصیحت واقعتاً قابل توجہ ہے لیکن کاش کہ طالب محسن صاحب جناب غامدی صاحب کو بھی یہ نصیحت کر سکتے کیونکہ ان کی کتاب 'برھان' میں اسی نوع کی تنقیدیں جا بجا موجود ہیں، خصوصاً ڈاکٹر اسرار صاحب اور پروفیسر طاہر القادری صاحب پر تنقید کے ضمن میں دلیل و تحقیق کی بجائے زبان و ادب کے جوہر زیادہ دکھائے گئے ہیں جسے علمی تنقید و تحقیق کی بجائے ادبی تنقید کا نام دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا، اگر طالب محسن صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ غامدی صاحب کے ساتھ اس قسم کی تحریروں سے زیادتی ہوئی ہے تو واضح رہے کہ غامدی صاحب نے بھی دوسروں پر تنقید کرتے ہوئے طعن و تشنیع اور تضحیک و استہزاء سے کم پر اکتفا نہیں کیا۔ اصولی طور پر طالب محسن صاحب کی بات سے کس کو اختلاف ہو سکتا ہے کہ مسلم معاشرے میں بحث مباحثے کے درمیان کسی مسئلے میں حق بات معلوم کرنے کے لئے ادبی و ذاتی تنقید کی بجائے علم و تحقیق کی روشنی میں متعین دلائل کو مثبت تنقید کی بنیاد بنایا جائے، لیکن دوسروں کو حق بات کی نصیحت کرنے سے پہلے انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود بھی اس پر عمل پیرا ہو اس لئے میرا طالب محسن صاحب اور ان کے ممدوح غامدی صاحب کو عاجزانہ مشورہ یہی ہے کہ وہ دوسروں پر برہان قائم کرنے کے لئے تضحیک و استہزاء پر مبنی ادبی و اخباری کالموں کو 'برہان' نہ بنائیں بلکہ مسلمہ اصول تحقیق و دلائل کی روشنی میں مثبت تنقید کرتے ہوئے ایک نئی 'برہان' کے ذریعے تنقید کے میدان میں لوگوں کے لئے ایک نمونہ قائم کریں تا کہ ان کے فکر و فلسفہ کی مخالفت کرنے والوں کے لئے قولی حجت کے ساتھ ساتھ فعلی حجت بھی قائم ہو جائے۔ غامدی صاحب کی 'برہان' جس قسم کی تنقیدوں سے بھری پڑی ہے کیا یہ اصولی تنقیدیں ہیں؟ قرآن کی کسی ایک آیت کے ترجمے کو بنیاد بنا کر یا 'مسئلہ بیعت' پر تنقید کر کے اگر غامدی صاحب کے متبعین یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اصولی تنقید کا حق ادا کر دیا ہے تو یہ ان کا زعم باطل ہے۔ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں جیسی تنقید انہوں نے دوسروں پر کی ہے ویسی ہی تنقید ان پر ہو رہی ہے۔ غامدی صاحب کی موجودہ 'برہان' جب تک موجود رہے گی ان کے مخالفین کو اس قسم کی ادبی، جذباتی اور بقول ان کے جزوی تنقید کا جواز فراہم کرتی رہے گی۔

## علامہ جاوید احمد غامدی اور اہل سنت کے اصولوں کا مختصر تقابل:

جہاں تک طالب محسن صاحب کا یہ دعوی ہے کہ غامدی صاحب پر کوئی علمی یا اصولی تنقید نہیں ہوئی تو ان کا یہ کہنا قطعاً درست نہیں ہے۔ اصل مسئلہ غامدی صاحب پر علمی و اصولی تنقید کے ہونے یا نہ ہونے کا نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ اصول تنقید کا ہے۔ اگر غامدی صاحب علمائے اہل سنت کے ان اصولوں ہی کو نہیں مانتے جن کی بنیاد پر نقد ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک واقعی ابھی تک ان پر تنقید ہوئی ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن اصولوں کی روشنی میں علماء نے ان پر تنقید کی ہے وہ ان اصولوں ہی کے قائل نہیں۔ غامدی صاحب اہل سنت سے الگ ہیں ان کا اہل سنت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی اہم وجوہات درج ذیل ہیں:

۱) اہل سنت کے ہاں اعتزال (قرآن سنت کی نصوص سے استدلال کرتے وقت اہل علم کے ہاں معروف طریق کار کو نظر انداز کرنا اور اس کے برعکس کسی انداز کو اختیار کرنا) ایک طرح کی گالی ہے جبکہ غامدی صاحب کے نزدیک یہی نادر انداز فخر کا باعث ہے۔ اس اصول کے تحت وہ آئے روز نت نئی تحقیقات پیش کرتے رہتے ہیں۔

۲) اہل سنت اجماع کو حجت سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف رائے دینے کو 'اتباع غیر سبیل المؤمنین' میں شمار کرتے ہیں جبکہ غامدی صاحب کہتے ہیں کہ اجماع دلیل ہے لیکن حجت نہیں ہے مطلب یہ کہ پوری امت گمراہی پر اکٹھی ہو سکتی ہے! اور یہ ممکن ہے کہ گزشتہ چودہ صدیوں میں کوئی شرعی مسئلہ کسی عالم یا فقیہ کو سمجھ نہ آیا ہو اور پہلی دفعہ ان پر یا ان کے امام صاحب پر منکشف ہوا ہو۔ اس اصول کے تحت انہوں نے بہت سے اجماعی مؤقفات کے برعکس اپنی رائے کا اظہار کیا۔

۳) اگر کسی مسئلہ میں اہل سنت کے علماء کہتے ہیں کہ اس مسئلے کی دلیل حدیث ہے تو غامدی صاحب فرماتے ہیں حدیث سے دین ثابت نہیں ہوتا یعنی حدیث سے دین میں کسی عقیدہ وعمل کا ہرگز کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ جبکہ علمائے اہل سنت کے نزدیک قرآن کی طرح حدیث سے بھی دین ثابت ہوتا ہے۔ اس اصول کے تحت انہوں نے شادی شدہ زانی کے لئے رجم کی سزا کا انکار کیا۔

۴) اہل سنت کہتے ہیں کہ قرآن کی طرح حدیث بھی دین اور اللہ کی شریعت کو ثابت کرنے والی ہے کیونکہ یہ وحی خفی ہے، جس طرح قرآن وحی جلی ہے اسی طرح حدیث بھی وحی کی ایک قسم ہے اور اسے وحی خفی کہتے ہیں۔ لیکن غامدی صاحب حدیث کو وحی کی حیثیت دینے سے انکاری ہیں۔ غامدی صاحب کہتے ہیں حدیث وحی نہیں، ہاں حجت ہوسکتی ہے۔ اس اصول کے تحت انہوں نے استخفاف حدیث کے فتنے کی بنیاد رکھی۔

۵) اہل سنت کے موقف کے مطابق اسلام کے بنیادی مآخذ شریعت، کتاب اللہ (قرآن مجید) اور سنت رسول ﷺ ہیں جبکہ غامدی صاحب کا موقف یہ ہے کہ جہاں تک سنت کا معاملہ ہے تو سنت رسول ﷺ کی نہیں ہوتی بلکہ سنت سے مراد سنت ابراہیمی ہے یعنی دین کی وہ روایت جو حضرت ابراہیم سے جاری ہوئی۔ اسی طرح غامدی صاحب کے نزدیک کتاب اللہ سے مراد صرف قرآن نہیں بلکہ کتاب الہی ہے یعنی تورات، انجیل، اور صحف ابراہیم بھی اس میں شامل ہیں۔ اس موقف کو سامنے رکھا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ

## غامدی صاحب اور اہل سنت کا اختلاف ایسا ہی ہے جیسا کہ اہل تشیع اور اہل سنت کا:

راقم نے سطور بالا میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اب تک غامدی صاحب پر کتاب وسنت اور حدیث واجماع کے اصولوں کی روشنی میں علماء نے جو تنقید کی ہے اس کو غامدی صاحب کے پیروکار علمی تنقید شمار کیوں نہیں کرتے؟ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اہل سنت اور ان کے مابین اصولی اختلاف ہے اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کے مآخذ دین علیحدہ ہیں، ان کی نصوص علیحدہ ہیں۔

اہل سنت کے ہاں کتاب وسنت حضرت محمد ﷺ سے شروع ہوتی ہے اور انہی پر ختم ہو جاتی ہے یعنی اہل سنت کے نزدیک کتاب سے مراد قرآن مجید ہے جو آپ پر نازل ہوا۔ اور سنت سے ان کی مراد آپ کی سنت ہوتی ہے۔ جبکہ غامدی صاحب کی کتاب وسنت حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہوتی ہے اور (ان کے بعد کے تمام اسرائیلی انبیاء کو شامل کرکے) محمد ﷺ پر ختم ہوتی ہے۔

اہل سنت کے علماء حضرت ابراہیم سے لے کر رسول ﷺ تک آنے والے تمام انبیاء ورسل کو مانتے ہیں اور ان پر نازل کردہ اصل کتب مثلاً تورات، انجیل اور صحف ابراہیم کو بھی کلام الہی مانتے ہیں لیکن جب وہ کتاب وسنت کو اپنی کتب میں بطور مآخذ شریعت بیان کرتے ہیں تو کتاب سے ان کی مراد 'قرآن مجید' اور سنت سے مراد 'سنت رسول ﷺ' ہوتی ہے۔ لہذا اہل سنت اور فرقہ غامدیہ کا اختلاف ایسا ہی ہے جیسا کہ اہل سنت اور اہل تشیع کا، کیونکہ دونوں کی کتاب وسنت علیحدہ ہے۔ یہاں تک ہم نے طالب محسن صاحب کی خدمت میں یہ بات پیش کی ہے کہ انہیں علماء کی طرف سے غامدی صاحب پر ہونے والی تنقید، تنقید کیوں نہیں نظر آتی۔ غامدی صاحب کے اصولوں پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں پیش کی جائے گی۔

یہ کتاب ان مضامین پر مشتمل ہے جو کہ ماہنامہ 'الشریعہ' میں شائع ہوئے بعد میں انہی مضامین کو یکجا کرکے کچھ اضافوں اور تبدیلیوں کے ساتھ ایک کتاب کی شکل دے دی گئی۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوا۔ جہاں علمی وفکری حلقوں میں اس کتاب کو کافی پذیرائی ملی وہاں عوام الناس کی طرف سے اسے آسان فہم بنانے کی خواہش کا بھی اظہار کیا گیا۔ بہرحال جس حد تک ہوسکتا تھا میں نے اپنی طرف سے اس کتاب کو آسان سے آسان بنانے کی کوشش کی ہے لیکن چونکہ یہ کتاب چند اصولی و فکری ابحاث پر مشتمل ہے اس لیے ممکن ہے کہ شاید عام قارئین اس سے ایک حد تک ہی استفادہ اٹھا سکیں۔ اب کچھ مزید اضافوں اور تبدیلیوں کے ساتھ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ اہل علم اس بارے میں اپنے مفید مشوروں سے نوازیں گے۔

## باب اول

# علامہ جاوید احمد غامدی کا تصورِ" فطرت"

فصل اول:

## غامدی صاحب کے مآخذ دین ایک نظر میں

مآخذ دین سے مراد وہ شرعی دلائل ہیں کہ جن سے شرعی احکام کو مستنبط کیا جاتا ہے اہل سنت کے ہاں یہ چار ہیں ۔قرآن' سنت' اجماع اور قیاس' یہ وہ مآخذ دین ہیں جو کہ فقہائے اہل سنت کے ہاں متفق علیہ ہیں اس کے علاوہ کچھ مآخذ ایسے بھی ہیں جو کہ فقہاء کے درمیان اختلافی ہیں مثلاً قول صحابی' استحسان' مصلحت مرسلہ' استصحاب' سد الذرائع' عرف وعادت' شرائع من قبلنا وغیرہ ۔اہل سنت کے مآخذ دین کے بالمقابل غامدی صاحب کے مآخذ علی الترتیب درج ذیل ہیں:

| اہل سنت کے مآخذ دین | غامدی صاحب کے مآخذ دین |
|---|---|
| ۱)۔قرآن | ۱)۔دین فطرت کے بنیادی حقائق |
| ۲)۔سنت رسول ﷺ | ۲)۔سنت ابراہیمی |
| ۳)۔اجماع | ۳)۔نبیوں کے صحائف |
| ۴)۔قیاس | ۴)۔قرآن |

غامدی صاحب کے اصل اصول یہی چار ہیں جبکہ ان چار کے علاوہ بھی غامدی صاحب کے کچھ اصول ہیں جن سے ضرورت پڑنے پر غامدی صاحب استدلال کرتے ہیں لیکن ان کو مستقل مآخذ دین نہیں سمجھتے ۔یہ اصول درج ذیل ہیں:

۵)۔حدیث

۶)۔اجماع

۷)۔امین احسن اصلاحی' جنہیں وہ امام کہتے ہیں ۔

اس باب میں ہم غامدی صاحب کے اصول 'دین فطرت کے بنیادی حقائق' پر کچھ معروضات پیش کریں گے ۔

غامدی صاحب کے نزدیک سب سے پہلا ماخذ کہ جس سے دین حاصل ہوتا ہے وہ فطرت انسانی ہے اور یہی ماخذ ان کے نزدیک اصل الاصول یعنی باقی تمام مآخذ کی بنیاد بھی ہے جیسا کہ ہم آگے چل کر اس کو ثابت کریں گے ۔دین کا دوسرا ماخذ ان کے نزدیک نبیوں کی سنت ہے یعنی ایسے اعمال کہ جن پر تمام انبیاء عمل کرتے چلے آئے ہیں ، چونکہ یہ اعمال حضرت ابراہیم کی زندگی میں آ کر ایک واضح شکل اختیار کر گئے تھے اس لیے اب ان اعمال کی نسبت پچھلے انبیاء کی بجائے حضرت ابراہیم کی طرف ہوگی ۔تیسرا ماخذ ان کے نزدیک نبیوں کے صحائف یعنی تورات ، انجیل اور زبور وغیرہ ہیں ۔اور دین کا چوتھا اور آخری ماخذ ان کے نزدیک قرآن مجید ہے ۔اسی لیے وہ قرآن کو دین کی آخری کتاب کہتے ہیں یعنی دین تو پہلے سے چلا آ رہا ہے اور قرآن نے آ کر اس کی تکمیل کی ہے ۔باقی جہاں تک حدیث رسول یا اجماع امت کا معاملہ ہے' اس کو غامدی صاحب دین کا کوئی مستقل ماخذ نہیں مانتے ۔لہذا غامدی صاحب کے اصل اصول چار ہی ہیں جن پر ان کی پوری فکر استوار ہے ۔غامدی صاحب نے اپنے ان چار اصولوں کو اپنی کتاب میزان (فصل اصول ومبادی) میں ص ۴۷ سے ص ۵۲ تک تفصیلا بیان کیا ہے ۔المورد کے ریسرچ سکالر اور غامدی صاحب کے شاگرد خاص جناب منظور الحسن صاحب ، غامدی صاحب کے مآخذ دین سے متعلقہ 'میزان' کی اس طویل عبارت کا خلاصہ اپنے استاد محترم کی رہنمائی میں ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

’’قرآن دین کی پہلی نہیں ، بلکہ آخری کتاب ہے اور دین کے مصادر قرآن کے علاوہ فطرت کے حقائق ،سنت ابراہیمی کی روایت اور قدیم صحائف بھی ہیں۔اس موضوع پر مفصل بحث استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی تالیف ’’میزان‘‘ کے صفحہ ۴۷ پر ’’دین کی آخری کتاب‘‘ کے زیر عنوان ملاحظہ کی جاسکتی ہے‘‘۔(۱)

ہم یہ مانتے ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ فطرت انسانی اس قابل ہے کہ اس سے دین اسلام‘ احکام الٰہی‘ اُوامر و نواہی یا حلال و حرام کا تعین ہوسکتا ہے‘اسلام کے دین فطرت ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالی نے بذریعہ وحی اپنے بندوں کو جس فعل کے بھی کرنے کا حکم دیا ہے فطرت سلیمہ اس فعل کے کرنے کی طرف ایک فطری رجحان اپنے اندر محسوس کرتی ہے اور جس فعل کے کرنے سے اللہ تعالی نے بذریعہ وحی ہمیں روک دیا ہے فطرت سلیمہ بھی اس فعل سے ابا محسوس کرتی ہے۔ احکام الٰہی فطرت انسانی کے مطابق تو ہیں لیکن فطرت انسانی سے ان کا تعین نہیں ہوسکتا‘ یہی غلط فہمی کہ جس میں آج غامدی صاحب مبتلا ہیں ایک دور میں معتزلہ کو لگی‘ معتزلہ کا کہنا یہ تھا کہ عقل سے شریعت کا تعین ہوسکتا ہے عقل جس چیز کو اچھا سمجھے گی شریعت کی نظر میں بھی وہ چیز مستحسن ہے اور عقل جس کو برا سمجھے گی شریعت کی نظر میں بھی وہ چیز بری ہے‘ معتزلہ نے جو مقام عقل انسانی کو دیا تھا غامدی صاحب اسی درجے پر فطرت انسانی کو رکھتے ہیں۔غامدی صاحب کے بقول اللہ کے احکامات‘ شریعت اسلامیہ‘ حلال و حرام اور اُوامر و نواہی کا تعین کرنے کے لیئے فطرت انسانی سب سے بڑا اور بنیادی ماخذ ہے۔قرون اولی میں امام ابوالحسن الأشعری اور امام ابومنصور ماتریدی نے معتزلہ کے اس مؤقف‘ کہ عقل سے بھی اللہ کے حکم کو معلوم کیا جاسکتا ہے‘ کا سختی سے رد کیا اور اہل سنت کے مؤقف کو واضح کیا‘ جس کی تفصیلات اُصول کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ہماری اس کتاب کا اصل مقصد بھی غامدی صاحب کے افکار کی روشنی میں سامنے آنے والے اعتزال جدید کی کج فہمیوں کو اہل سنت کے اصولوں کی روشنی میں واضح کرنا ہے۔اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم اپنی اصل بحث کی طرف آتے ہیں۔

فصل دوم:

# غامدی صاحب کا تصور فطرت

غامدی صاحب اپنی کتاب میزان (اصول ومبادی) میں لکھتے ہیں:

''اس دنیا میں اللہ تعالی نے جو جانور پیدا کیے ہیں، ان میں سے بعض کھانے کے ہیں اور بعض کھانے کے نہیں ہیں۔ یہ دوسری قسم کے جانور اگر کھائے جائیں تو اس کا اثر چونکہ انسان کے تزکیہ پر پڑتا ہے، اس لیے ان سے اِبا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ انسان کی یہ فطرت بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کر لیتا ہے کہ اسے کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں کھانا چاہیے۔ اسے معلوم ہے کہ شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گدھ، عقاب، سانپ، بچھو، اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ گھوڑے، گدھے، دستر خوان کی لذت کے لیے نہیں، سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان جانوروں کے بول و براز کی نجاست سے بھی وہ پوری طرح واقف ہے۔ اس میں شبہ نہیں اس کی یہ فطرت کبھی کبھی مسخ بھی ہو جاتی ہے، لیکن دنیا میں انسانوں کی عادات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد اس معاملے میں عموماً غلطی نہیں کرتی۔ چنانچہ خدا کی شریعت نے بھی ان جانوروں کی حلت و حرمت کو اپنا موضوع نہیں بنایا، بلکہ انسان کو اس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے۔ اس باب میں شریعت کا موضوع صرف وہ جانور اور ان کے متعلقات ہیں جن کی حلت و حرمت کا فیصلہ تنہا عقل وفطرت کی رہنمائی میں کر لینا ممکن نہ تھا۔ سؤر انعام کی قسم بہائم میں سے ہے، لیکن درندوں کی طرح گوشت بھی کھاتا ہے، پھر اسے کیا کھانے کا جانور سمجھا جائے یا نہ کھانے کا؟ وہ جانور جنھیں ہم ذبح کر کے کھاتے ہیں اگر تذکیے کے بغیر مر جائیں تو ان کا کیا حکم ہونا چاہیے؟ انھی جانوروں کا خون کیا ان کے بول و براز کی طرح نجس ہے یا اسے حلال وطیب قرار دیا جائے گا؟ یہ اگر خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کر دیے جائیں تو کیا پھر بھی حلال ہی رہیں گے؟ ان سوالوں کا کوئی واضح اور قطعی جواب چونکہ انسان کے لیے دینا مشکل تھا، اس لیے اللہ تعالی نے اپنے نبیوں کے ذریعے اسے بتایا کہ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے پاک نہیں ہیں اور انسان کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جانوروں کی حلت و حرمت میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں۔ چنانچہ قرآن نے بعض جگہ 'قل لا أجد فیما أوحی' اور بعض جگہ 'انما' کے الفاظ میں پورے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ تعالی نے جانوروں کی حلت و حرمت کے باب میں صرف یہی چار چیزیں حرام قرار دی ہیں... بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ نبی ﷺ نے کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ یہ اسی فطرت کا بیان ہے جس کا علم انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ ہم اگر چاہیں تو ممنوعات کی اس فہرست میں بہت سی دوسری چیزیں بھی اس علم کی روشنی میں شامل کر سکتے ہیں۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اسے بیان فطرت کے بجائے بیان شریعت سمجھا، دراں حالیکہ شریعت کی ان حرمتوں سے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں، اس کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر حدیث سے قرآن کے نسخ یا اس کے مدعا میں تبدیلی کا کوئی مسئلہ پیدا کیا جائے۔(۲)

اسی طرح غامدی صاحب ایک اور جگہ اپنی کتاب میزان (اصول ومبادی) میں لکھتے ہیں:

''قرآن کی دعوت اس کے پیش نظر جن مقدمات سے شروع ہوتی ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ دین فطرت کے حقائق،

۲۔ سنت ابراہیمی،

۳۔ نبیوں کے صحائف۔

پہلی چیز کو وہ اپنی اصطلاح میں معروف ومنکر سے تعبیر کرتا ہے۔یعنی وہ باتیں جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور وہ جس سے فطرت ابا کرتی اور انھیں برا سمجھتی ہے۔قرآن ان کی کوئی جامع مانع فہرست پیش نہیں کرتا بلکہ اس حقیت کو مان کر کہ انسان ابتدا ہی سے معروف ومنکر، دونوں کو پورے شعور کے ساتھ بالکل الگ الگ پہنچانتا ہے، اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ معروف کو اپنائے اور منکر کو چھوڑ دے

**و المؤمنون و المؤمنات بعضهم أولياء بعض يأمرون بالمعروف و ينهون عن المنكر**

اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں، یہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ یہ باہم دگر معروف کی نصیحت کرتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔

اس معاملے میں اگر کسی جگہ اختلاف ہو تو زمانہ رسالت کے اہل عرب کا رجحان فیصلہ کن ہوگا۔''(۳)

المورد کے ریسرچ سکالر جناب منظور الحسن صاحب، غامدی صاحب کے مآخذ دین کے بارے میں لکھتے ہیں:

''قرآن مجید دین کی آخری کتاب ہے۔دین کی ابتدا اس کتاب سے نہیں، بلکہ ان بنیادی حقائق سے ہوتی ہے جو اللہ تعالی نے روز اول سے انسانی فطرت میں ودیعت کر رکھے ہیں۔اس کے بعد وہ شرعی احکام ہیں جو وقتاً فوقتاً انبیاء کی سنت کی حیثیت سے جاری ہوئے اور بالآخر سنت ابراہیمی کے عنوان سے بالکل متعین ہو گئے۔ پھر تورات، زبور اور انجیل کی سورت میں آسمانی کتابیں ہیں جن میں ضرورت کے لحاظ سے شریعت اور حکمت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔اس کے بعد نبی ﷺ کی بعثت ہوئی ہے اور قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن دین کی پہلی نہیں، بلکہ آخری کتاب ہے اور دین کے مصادر قرآن کے علاوہ فطرت کے حقائق، سنت ابراہیمی کی روایت اور قدیم صحائف بھی ہیں۔اس موضوع پر مفصل بحث استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی تالیف ''میزان'' کے صفحہ ۴۷ پر ''دین کی آخری کتاب'' کے زیر عنوان ملاحظہ کی جا سکتی ہے''۔(۴)

فصل سوم:

# غامدی صاحب کے اصول فطرت کی غلطی

غامدی صاحب کا مذکورہ بالا اصول فطرت غلط ہے اور اس کی غلطی کی درج ذیل وجوہات ہیں:

## کیا شریعت نے صرف چار چیزوں کو حرام قرار دیا ہے؟:

غامدی صاحب کا یہ دعوی ہے کہ شریعت نے کھانے کے جانوروں میں صرف چار چیزوں سؤر' خون' مردار اور خدا کے علاوہ کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کو حرام قرار دیا ہے۔ غامدی صاحب میزان (اصول و مبادی) میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالی نے اپنے نبیوں کے ذریعے اسے بتایا کہ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے پاک نہیں ہیں اور انسان کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جانوروں کی حلت و حرمت میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں۔ چنانچہ قرآن نے بعض جگہ 'قل **لا أجد فیما أوحی**' اور بعض جگہ 'انما' کے الفاظ میں پورے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ تعالی نے جانوروں کی حلت و حرمت کے باب میں صرف یہی چار چیزیں حرام قرار دی ہیں''۔(۵)

غامدی صاحب نے اپنے ایک غلط اصول (کہ حدیث کے ذریعے قرآن پر اضافہ یا اس کا نسخ نہیں ہو سکتا) کو سیدھا کرنے کے لیے یہ سارا فلسفہ گھڑا۔ غامدی صاحب کے نزدیک گدھا حرام ہے لیکن اس لیے نہیں کہ شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے بلکہ ان کی فطرت انھیں یہ بتلاتی ہے کہ گدھا سواری کرنے کا جانور ہے نہ کہ کھانے کا' اس لیے یہ فطری محرمات میں سے ہے۔ غامدی صاحب میزان (اصول و مبادی) میں لکھتے ہیں:

''وہ (یعنی انسان) جانتا ہے کہ گھوڑے، گدھے، دستر خوان کی لذت کے لیے نہیں، سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں''۔(۶)

غامدی صاحب کی فطرت کا اونٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ بھی تو سواری کا جانور ہے امر واقعہ تو یہ ہے کہ آپؐ کے زمانے میں عرب میں سواری کے لیے سب سے زیادہ استعمال ہونے والا جانور اونٹ تھا اس کے بعد گھوڑا' اور گدھے کا استعمال سواری کے لیے تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ غامدی صاحب کی فطرت گدھے کو حرام اور اونٹ کو حلال قرار دیتی ہے۔ اگر غامدی صاحب یہ کہتے ہیں کہ اونٹ کو قرآن نے حلال قرار دیا ہے تو پھر غامدی صاحب کے اس بیان کا کیا مطلب ہے کہ

''جانوروں کی حلت و حرمت میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں''۔(۷)

فطری محرمات کا اصول وضع کر کے غامدی صاحب نے دین میں ایک نئے فتنے کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اور یہ فتنہ کس طرح آگے بڑھ رہا ہے اس کا اندازہ المورد کے ایک ریسرچ سکالر امیر عبد الباسط صاحب کے شراب سے متعلقہ ایک سوال کے جواب سے ہوتا ہے:

''اپنے پچھلے جواب میں ہم نے (شراب کے لیے) ناپسندیدہ کا لفظ حرمت کے مقابلے میں اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ اس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ شراب پینا شرعی حرمتوں میں سے نہیں ہے بلکہ وہ تو اس سے بھی زیادہ بنیادی یعنی فطری حرمتوں میں سے ہے...آپ (سائل) نے فرمایا کہ ہماری رائے نصوص شریعہ کے خلاف ہے۔ اگر آپ قرآن کی کوئی ایسی آیت پیش کر دیں جس میں اللہ تعالی نے شراب کو واضح لفظوں میں حرام قرار دیا ہے تو ہمیں اپنی رائے سے رجوع کرنے میں ہرگز کوئی تأمل نہیں ہوگا۔''(۸)

یہ فتاوی جات غامدی صاحب کی نگرانی میں قائم شدہ المورد کی سرکاری ویب سائیٹ (urdu.understanding-islam.org) پر جاری کیے جا رہے ہیں۔ کیا شراب کی حرمت کے بارے میں قرآن کے چار مختلف انداز سے تاکیدی اور صریح بیانات 'رجس' اور '**من عمل الشیطان**' اور '**فاجتنبوہ**' اور '**فھل أنتم منتھون**' سے بھی اس کی شرعی حرمت ثابت نہیں ہوتی؟۔ **واللہ المستعان علی ما تصفون**۔

## کیا فطرت انسانی سے حلال وحرام کا تعین ہوسکتا ہے:

غامدی صاحب کے نزدیک کھانے کے جانوروں میں حلال وحرام کے تعین میں فطرت بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''خدا کی شریعت نے بھی ان جانوروں کی حلت وحرمت کو اپنا موضوع نہیں بنایا، بلکہ انسان کو اس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے۔ اس باب میں شریعت کا موضوع صرف وہ جانور اور ان کے متعلقات ہیں جن کی حلت وحرمت کا فیصلہ تنہا عقل وفطرت کی رہنمائی میں کر لینا ممکن نہ تھا۔''(۹)

غامدی صاحب کے نزدیک شریعت نے کھانے کے جانوروں میں صرف چار چیزوں کو حرام کیا ہے اس کے علاوہ حرام جانوروں کے بارے میں ہم اپنی فطری رہنمائی کی روشنی میں ایک جامع فہرست تیار کر سکتے ہیں۔ ایک جگہ میزان (صول ومبادی) میں لکھتے ہیں:

بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ نبی ﷺ نے کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ یہ اسی فطرت کا بیان ہے جس کا علم انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ ہم اگر چاہیں تو ممنوعات کی اس فہرست میں بہت سی دوسری چیزیں بھی اس علم کی روشنی میں شامل کر سکتے ہی۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اسے بیان فطرت کے بجائے بیان شریعت سمجھا، دراں حالیکہ شریعت کی ان حرمتوں سے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں' اس کا سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔(۱۰)

ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ غامدی صاحب کی یہ مذکورہ بالا عبارات کس قدر گمراہ کن افکار پر مشتمل ہیں۔ کسی چیز کو حلال وحرام ٹھہرانے کا اختیار اصلا اللہ کے پاس اور تبعا اس کے رسول کے پاس ہوتا ہے۔ غامدی صاحب کا عام انسانوں کو تحلیل وتحریم کا اختیار تفویض کرنا خدائی دعوی کرنے کے مترادف ہے غامدی صاحب کو یہ اختیار کس نے دیا ہے کہ وہ عام انسانوں کے بارے یہ کہیں کہ وہ اپنی فطرت سے جس کو چاہیں حلال بنالیں اور جس کو چاہیں حرام ٹھہرالیں۔ قرآن نے دوٹوک الفاظ میں واضح کر دیا ہے کہ تحلیل و تحریم کا اختیار کسی انسان کے پاس نہیں ہے۔ مشرکین مکہ نے جب اپنی طرف سے بعض کھانے کی چیزوں کو حرام قرار ٹھہرالیا تو قرآن نے ان کے اس اقدام پر تنقید کی۔ ارشاد باری تعالی ہے:

**و حرموا ما رزقهم الله افتراء على قد ضلوا و ماكانوا مهتدين** (الأنعام: ١٤٠)

اورانھوں نے اللہ کے عطا کردہ رزق کو حرام ٹھہرالیا اللہ پر جھوٹ بولتے ہوئے تحقیق وہ گمراہ ہوئے اور وہ ہدایت پانے والوں میں سے نہ تھے۔

اگر شریعت نے بقول غامدی صاحب کھانے کے جانوروں میں صرف چار کو ہی حرام قرار دیا تھا اور باقی جانوروں کی حلت وحرمت کا فیصلہ انسانی فطرت پر چھوڑ دیا تھا تو اللہ تعالی نے مشرکین مکہ کے اس فعل پر تنقید کیوں کی کہ انھوں نے اپنی مرضی سے بعض جانوروں کو حرام ٹھہرالیا؟۔ اسی طرح ارشاد باری تعالی ہے:

**قل آالذكرين حرم أم الأنثيين أما اشتملت عليه أرحام الأنثيين**(الأنعام:١٤٣)

اے نبی ﷺ ان سے کہ دیں کیا اللہ تعالی نے دونوں مذکر (نر) کو حرام کیا ہے یا دونوں مؤنث (مادہ) کو یا اس کو جو دونوں مؤنث (مادہ) کے رحم میں ہو۔

یہ آیت بھی اس بات کی صریح دلیل ہے کہ تحلیل وتحریم کا اختیار اللہ کے پاس ہے نہ کہ انسانی فطرت کے پاس۔ ایک اور جگہ ارشاد باری تعالی ہے:

**قل هلم شهداء كم الذين يشهدون أن الله حرم هذا**(الأنعام:١٥٠)

اے نبی ﷺ آپ ان سے کہہ دیں کہ تم اپنے گواہوں کو لے آؤ جو یہ گواہی دیں کہ اللہ تعالی نے اس کو حرام ٹھہرایا ہے۔

اگر صرف فطرت سے محرمات کا تعین جائز ہوتا تو اللہ تعالی مشرکین سے یہ مطالبہ نہ کرتا کہ ان جانوروں کی حرمت پر اللہ کی نازل کردہ شریعت سے کوئی دلیل پیش کرو۔ ایک اور جگہ مشرکین مکہ سے خطاب ہے:

**و لا تقولوا لما تصف ألسنتكم الكذب هذا حلال و هذا حرام لتفتروا على الله الكذب** (النحل :١٦٦)

اور مت تم کہو جو کہ تمہاری زبانیں جھوٹ بکتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تا کہ تم اللہ تعالی پر جھوٹ باندھ سکو۔

یہ آیت بھی اس مسئلے میں نص ہے کہ انسانی فطرت سے حلال وحرام کا تعین کرنا اللہ پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہے۔

## کس کی فطرت کا اعتبار ہوگا؟

غامدی صاحب کے نزدیک کھانے کے جانوروں میں انسانی فطرت سے حلال وحرام کا تعین ہوگا۔لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اختلاف فطرت کی صورت میں کس کی فطرت معتبر ہوگی؟ مثلاً غامدی صاحب نے موسیقی کو مباحات فطرت میں شامل کیا ہے جبکہ علماء اس کو محرمات میں شمار کرتے ہیں۔اب کس کی فطرت کو لیں گے اور کس کی فطرت کو چھوڑیں گے؟ غامدی صاحب اس مسئلے کا حل تجویز کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر کسی کھانے کے جانور کے بارے میں انسانی فطرت کی آراء مختلف ہو جائیں تو جمہور کی رائے پر عمل کیا جائے گا۔غامدی صاحب میزان (اصول ومبادی) میں لکھتے ہیں:

''اس میں شبہ نہیں اس کی یہ فطرت کبھی کبھی مسخ بھی ہو جاتی ہے،لیکن دنیا میں انسانوں کی عادات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد اس معاملے میں عموماً غلطی نہیں کرتی''۔(۱۱)

غامدی صاحب کے اس سنہری اصول کی روشنی میں دنیا کے انسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسانوں کی ایک بڑی تعداد نے سؤر تک کو اپنی فطرت سے حلال کر رکھا ہے۔اور کچھ بعید نہیں کہ مستقبل قریب میں المورد کا کوئی ریسرچ سکالر یہ تحقیق پیش کر دے کہ قرآن نے جس سؤر کو حرام قرار دیا ہے وہ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے کا سؤر ہے، رہا آج کا سؤر کہ جس کی مغرب میں باقاعدہ فارمنگ کی جاتی ہے، وہ فطرتاً حلال ہے۔اہل مغرب کو تو چھوڑیئے مسلمانوں کو دیکھ لیں ان کی اکثریت کے ہاں حلال وحرام کا کیا معیار ہے جسے غامدی صاحب اپنے اصول فطرت میں اختلاف کی صورت میں بطور دلیل پیش کر رہے ہیں۔

## غامدی صاحب نے انسان کو شارع بنا دیا:

غامدی صاحب نے انسانی فطرت کو تحلیل وتحریم کا اختیار تفویض کر کے اس کو شارع بنا دیا ہے اور اللہ کے بالمقابل لا کھڑا کیا ہے۔اگر انسان کی فطرت کے پاس کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانے کا اختیار ہے تو انسان بھی شارع ہے۔اور انسان کو شارع بنانا اللہ کے ساتھ اس کو شریک کرنے کے مترادف ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

**سیقول الذین أشرکوا لو شاء اللہ ما أشرکنا و لا أباؤنا و لا حرمنا من شیء**(الأنعام:۱۴۸)

عنقریب وہ لوگ کہیں گے جنھوں نے شرک کیا اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہ کرتے اور نہ ہی ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔

نفی کے سیاق میں اگر نکرہ آئے تو وہ عبارت اپنے عموم میں نص بن جاتی ہے۔لہذا مذکورہ بالا آیت بھی اپنے عموم میں نص ہے یعنی کسی چیز کو بھی حرام قرار دینے کا اختیار انسان کے پاس نہیں ہے۔ایک آیت میں اس سے بھی زیادہ صراحت سے 'من دونہ' کے الفاظ کے ساتھ اس مفہوم کو بیان کیا گیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

**و قال الذین أشرکوا لو شاء اللہ ما عبدنا من دونہ من شیء نحن و لا آباؤنا و لا حرمنا من دونہ من شیء** (النحل:۳۵)

اور کہا ان لوگوں نے جنھوں نے شرک کیا اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرتے اور ہم اس کے بغیر کسی چیز کو بھی حرام نہ ٹھہراتے۔

یہ آیات اس مسئلے میں صریح نص کا درجہ رکھتی ہیں کہ شارع صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور کوئی چیز اس وقت حلال ہوگی جبکہ اللہ تعالیٰ اس کو حلال قرار دے اور اس وقت حرام ہوگی جبکہ اللہ تعالیٰ اس کو حرام قرار دے اور انسان کے پاس کسی بھی چیز کو حرام قرار دینے کا اختیار نہیں ہے۔

## اللہ کے رسول ﷺ اور تحلیل وتحریم:

غامدی صاحب نے ہر انسان کو تو یہ حق دے دیا کہ اپنی فطرت سے حلال وحرام کی فہرست تیار کرے لیکن وہ اللہ کے رسولؐ کے پاس یہ اختیار ماننے سے انکاری ہیں۔غامدی صاحب اصول ومبادی میں لکھتے ہیں:

بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ نبی ﷺ نے کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ یہ اسی فطرت کا بیان ہے جس کا علم انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ہم اگر چاہیں تو ممنوعات کی اس فہرست میں بہت سی دوسری چیزیں

بھی اس علم کی روشنی میں شامل کر سکتے ہی ۔لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اسے بیان فطرت کے بجائے بیان شریعت سمجھا، دراں حالیکہ شریعت کی ان حرمتوں سے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں، اس کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر حدیث سے قرآن کے نسخ یا اس کے مدعا میں تبدیلی کا کوئی مسئلہ پیدا کیا جائے۔(۱۲)

غامدی صاحب اپنی فطرت کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ قرآنی محرمات ( أربعہ ) کی فہرست میں جتنا چاہے اضافہ کر لے۔لیکن اللہ کے رسول ﷺ کے بارے ان کا یہ خیال ہے کہ آپؐ کے کسی فرمان سے ان چار قرآنی محرمات کی فہرست میں اضافہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے قرآن کا نسخ یا اس کے مدعا میں تبدیلی لازم آتی ہے' جو کہ جائز نہیں ہے۔ہم یہ کہتے ہیں کہ غامدی صاحب اپنی فطرت سے قرآنی محرمات میں جو اضافہ کر رہے ہیں تو اس سے کیا قرآن کا نسخ یا اس کے مدعا میں تبدیلی لازم نہیں آتی۔غامدی صاحب اپنی فطرت سے قرآنی حکم کے نسخ' اس میں اضافے اور اس کے مدعا میں تبدیلی کے قائل ہیں لیکن احادیث رسول ﷺ کو یہ مقام دینے کو تیار نہیں' کیوں؟۔کیا انسانی فطرت کا رتبہ معاذ اللہ' نبوت و رسالت سے بڑھ کر ہے؟۔

## مقدم کون؟ نور فطرت یا نور وحی:

غامدی صاحب کے نزدیک انسانی ہدایت و رہنمائی کے دو بڑے ذریعے ہیں ایک انسانی فطرت اور دوسرا وحی۔لیکن ان میں بھی غامدی صاحب فطرت کی رہنمائی کو وحی کی رہنمائی پر مقدم رکھتے ہیں۔غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''دین کی تاریخ یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالی نے دنیا میں بھیجا تو اس (یعنی دین) کے بنیادی حقائق ابتدا ہی سے اس کی فطرت میں ودیعت کر دیے پھر اس کے ابوالآباء حضرت آدم کی وساطت سے اسے بتا دیا گیا کہ...اس کی ضرورتوں کے پیش نظر اس کا خالق وقتاً فوقتاً اپنی ہدایت اسے بھیجتا رہے گا...چنانچہ پروردگار نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا اور انسانوں ہی سے کچھ ہستیوں کو منتخب کر کے ان کے ذریعے سے اپنی یہ ہدایت بنی آدم کو پہنچائی اس میں حکمت (یعنی ایمانیات اور اخلاقیات) بھی تھی اور شریعت بھی۔''(۱۳)

غامدی صاحب کا یہ نقطہ نظر قرآنی آیات کے مخالف ہے اللہ تعالی نے جب سے آدم کو اس دنیا میں بھیجا ہے اس دن سے ہی اس کی رہنمائی کے لیے وحی کا سلسلہ جاری فرما دیا ہے ارشاد باری تعالی ہے:

**قلنا اهبطوا منها جميعا فاما يأتينكم منى هدى فمن تبع هداى فلا خوف عليهم و لا هم يحزنون و الذين كفروا و كذبوا بآيتنا أولئك أصحب النار هم فيها خلدون**(البقرة :۳۸'۳۹)

ہم نے کہا تم سب (یعنی آدم اور ان کی ہونے والی ذریت) اس جنت سے اتر جاؤ پس اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو اس پر نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا اور میری آیات کو جھٹلایا وہ لوگ آگ والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

**قلنا اهبطا منها جميعا فاما يأتينكم منى هدى فمن اتبع هداى فلا يضل و لا يشقى** (طه :۱۲۳)

ہم نے کہا تم (دونوں یعنی) سب اس جنت سے اترو پس اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو وہ نہ تو وہ (دنیا میں) گمراہ ہوگا اور نہ ہی (آخرت میں) بدبخت ہوگا۔

اس انتہائی اہم موقعے پر جب کہ حضرت آدم کو اور ان کی آنے والی ذریت کو جنت سے اتار کر اس دنیا میں بھیجا جا رہا ہے تو اس وقت انھیں صرف ایک ہی چیز کی پیروی کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے اور وہ اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت ہے اور دونوں جگہ قرآن کے الفاظ 'منی ھدی ' اور اس کا سیاق و سباق بتلاتا ہے کہ اس ہدایت سے مراد کوئی فطری ہدایت نہیں بلکہ اللہ کی آیات اور اس کی طرف سے نازل کردہ وحی کی رہنمائی مراد ہے۔اس سے یہ ثابت ہوا کہ پہلے ہی دن سے اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے حضرت

آدم اوران کی آنے والی ذریت کو جو رہنمائی دی جا رہی ہے وہ وحی کی رہنمائی ہے اور جس نے بھی اللہ کی دی ہوئی اس وحی کی رہنمائی سے استفادہ کرنے سے انکار کیا تو وہی لوگ اللہ کے عذاب کے مستحق ہیں۔

## فطرت انسانی سے معروف ومنکر کا تعین:

غامدی صاحب کے نزدیک اُمر بالمعروف اور نھی عن المنکر میں 'معروف' اور 'منکر' کا تعین شریعت نہیں بلکہ فطرت انسانی کرے گی۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''پہلی چیز کو وہ اپنی اصطلاح میں معروف ومنکر سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور وہ جس سے فطرت ابا کرتی اور انھیں برا سمجھتی ہے۔ قرآن ان کی کوئی جامع مانع فہرست پیش نہیں کرتا بلکہ اس حقیت کو مان کر کہ انسان ابتدا ہی سے معروف ومنکر، دونوں کو پورے شعور کے ساتھ بالکل الگ الگ پہنچانتا ہے، اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ معروف کو اپنائے اور منکر کو چھوڑ دے''۔ (۱۴)

اگر معروف ومنکر شریعت کا موضوع نہیں ہے تو اللہ کے رسول ﷺ کی اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟

**من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ (۱۵)**

جو بھی تم میں سے کسی منکر کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے تبدیل کر دے اگر اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو اپنی زبان سے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہیں رکھتا تو اپنے دل سے۔

اللہ کے رسول ﷺ منکر کو ہاتھ سے روکنے کا حکم دے رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے منکرات کا تعین کر دیا ہے۔ اگر غامدی صاحب کا یہ نظریہ مان لیا جائے کہ معروف اور منکر کا تعین فطرت انسانی سے ہوگا تو شریعت اسلامیہ ایک کھیل تماشہ بن جائے گی۔ ایک شخص کے نزدیک ایک فعل معروف ہوگا جبکہ دوسرے کے نزدیک وہی فعل منکر ہوگا۔ مثلاً غامدی صاحب کے نزدیک موسیقی معروف کے تحت آئے گی۔ اب غامدی صاحب کو قرآن کا یہ حکم ہے کہ وہ اُمر بالمعروف کا فریضہ سرانجام دیں یعنی لوگوں کو موسیقی سننے کا حکم دیں جبکہ علماء موسیقی کو منکرات میں شامل کرتے ہیں اور علماء کو اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ہے کہ وہ منکرات کو بزور بازو روکیں یعنی غامدی صاحب کو موسیقی کے جواز کا فتوی دینے سے بزور بازو روکیں۔

امام رازی، امام ابوبصاص، علامہ سید آلوسی، علامہ ابن حجر ہیثمی، علامہ مناوی، ملاعلی القاری، علامہ ابوحیان الاندلسی، امام طبری، امام ابن تیمیہ، امام شوکانی، علامہ ابن الاثیر الجزری، علامہ صاوی اور علامہ عبدالقادر عودہ نے واضح اور صریح الفاظ میں اپنے اس مؤقف کو بیان کیا ہے کہ معروف ومنکر کا تعین شریعت سے ہوگا۔ ان علماء وائمہ کی آراء کا تفصیل سے مطالعہ کرنے کے لیے سید جلال الدین عمری کی کتاب 'معروف ومنکر' کا مطالعہ مفید رہے گا۔ (۱۶)

## کیا فطرت انسانی مأخذ شریعت ہے؟:

غامدی صاحب عالم اسلام کے وہ پہلے نامور سکالر ہیں کہ جنھوں نے فطرت انسانی کو مصادر شریعت میں شمار کیا اور اسے حلال وحرام کی تمیز میں میزان قرار دیا۔ امام شافعی سے لے کر امام شوکانی تک کسی بھی اصولی (اصول فقہ کے ماہرین) نے اپنی کتاب میں مصادر شریعت کی بحث میں 'فطرت انسانی' کا تذکرہ نہیں کیا۔ علماء اور فقہاء نے ہر دور میں قرآن، سنت، اجماع اور قیاس وغیرہ جیسے مآخذ شریعت کے ذریعے سے شرعی احکام تک پہنچنے کی کوشش کی ہے لیکن کسی بھی فقیہ یا عالم نے امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ میں 'فطرت انسانی' کو کبھی بھی استنباط احکام کے لیے بطور اصول یا مأخذ شریعت بیان نہیں کیا۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ غامدی صاحب نئی فقہ کے ساتھ ساتھ نئی اصول فقہ بھی مرتب کرنے کا شوق پورا فرما رہے ہیں، غامدی صاحب اپنا یہ شوق ضرور پورا فرمائیں لیکن علم وتحقیق کی روشنی میں۔ غامدی صاحب نے 'فطرت انسانی' کو مصدر شریعت تو بنا دیا لیکن اس کی ان کے پاس دلیل کیا ہے کہ 'فطرت انسانی' مصدر شریعت ہے؟۔ بلکہ دلیل تو غامدی صاحب کے خلاف قائم ہے۔ عام انسان تو کجا اللہ کے رسول ﷺ کے پاس بھی یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ اللہ کی مرضی کے بغیر اپنی فطرت سے کسی چیز کو حرام قرار دیتے۔ آپ کھانے کی بعض اشیاء کو فطرتاً ناپسند کرتے تھے اور انھیں کھانے سے اجتناب کرتے تھے لیکن آپ نے ان کو حرام قرار نہیں دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے:

**أتى النبى ﷺ بضب مشوى فأهوى اليه ليأكل فقيل له أنه ضب فأمسك يده فقال خالد أحرام هو قال لا و لكنه لا يكون بأرض قومى فأجدنى أعافه فأكل خالد ورسول الله ﷺ ينظر**[۹]

اللہ کے رسول ﷺ کے پاس ایک بھنی ہوئی گوہ لائی گئی۔آپ اس کو کھانے کے لیے جھکے تو آپ سے کہا گیا کہ یہ گوہ ہے پس آپ نے اپنا ہاتھ روک لیا حضرت خالد بن ولید نے سوال کیا یہ حرام ہے؟ تو آپ نے جواب دیا: نہیں، لیکن چونکہ یہ جانور میری قوم کی سرزمین (یعنی مکہ) میں نہیں پایا جاتا اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔پس حضرت خالد نے اس کو کھایا اور آپؐ حضرت خالد کو دیکھ رہے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

**أهدت خالة ابن عباس الى النبى ﷺ أقطا و سمنا و أضبا فأكل النبى ﷺ من الأقط و السمن و ترك الضب تقذرا قال ابن عباس فأكل على مائدة رسول الله ﷺ و لو كان حراما ما أكل على مائدة رسول الله ﷺ**[۱۰]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خالہ نبی ﷺ کی طرف کچھ پنیر، گھی اور گوہ ہدیہ کے طور پر بھیجے۔پس آپؐ نے پنیر اور گھی کھا لیا اور گوہ سے کراہت کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ گوہ آپؐ کے دسترخوان پر کھائی گئی اگر وہ حرام ہوتی تو آپؐ کے دسترخوان پر نہ کھائی جاتی۔

مذکورہ بالا روایات سے درج ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱)۔اللہ کے رسول ﷺ نے گوہ کے گوشت کو طبعاً ناپسند فرمایا۔

۲)۔آپؐ کے سامنے گوہ کا گوشت کھایا گیا اور آپؐ نے اس سے منع نہیں فرمایا۔

۳)۔ایک کھانے کے جانور سے آپؐ کی فطرت ابا کر رہی تھی لیکن آپؐ نے اسے اپنی فطری ناپسندیدگی کی وجہ سے حرام قرار نہیں دیا۔

۴)۔اللہ کے رسول ﷺ اپنی طرف سے (یعنی وحی کے بغیر) کسی چیز کو حرام قرار نہیں دے سکتے۔

۵)۔فطرت انسانی اگر ایک چیز سے ابا کرتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ حرام ہے جیسا کہ غامدی صاحب کہتے ہیں۔

۶)۔تحلیل و تحریم کی اصل بنیاد وحی ہے نہ کہ فطرت انسانی۔

فصل چہارم:

# غامدی صاحب کے اصول فطرت کی دلیل کا تجزیہ

غامدی صاحب نے پنجاب یونیورسٹی میں اپنے ایک لیکچر کے دوران اپنے تصور فطرت کے حق میں جو دلیل بیان کی ہے وہ سورہ شمس کی درج ذیل آیات ہیں:

**و نفس وما سواها فألهمها فجورها وتقواها قد أفلح من زكها و قد خاب من دسها**(الشمس:۷ تا ۱۰)

غامدی صاحب اس آیت کا یہ مفہوم بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالی نے انسانی فطرت میں نیکی اور بدی کا علم رکھ دیا ہے، یہ مفہوم بوجوہ غلط ہے۔

۱)۔ یہ مفہوم قرآن کی واضح نص کے خلاف ہے۔ارشاد باری تعالی ہے:

**والله أخرجكم من بطون أمهتكم لا تعلمون شيئا** (النحل :۷۸)

'اللہ تعالی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حال کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے'

اسی لیے امام ابن قیم لکھتے ہیں:

**ليس المراد بقوله 'يولد على الفطرة 'أنه خرج من بطن أمه يعلم الدين لأن الله تعالى يقول والله أخرجكم من بطون أمهتكم لا تعلمون شيئاو لكن المراد أن فطرته مقضية معرفة دين الاسلام و محبته**(۱۹)

'**يولد على الفطرة** ' سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے دین کا علم لے کر آیا ہے۔اللہ تعالی فرماتے ہیں''اللہ تعالی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حال کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے''۔ بلکہ حدیث سے مراد یہ ہے کہ انسان کی فطرت دین اسلام کی معرفت اور اس کی محبت کا تقاضا کرتی ہے۔

۲)۔ یہ مفہوم حدیث کے خلاف ہے۔آپ ؐکا ارشاد ہے:

**اللهم آت نفسي تقواها و زكها أنت خير من زكها**(۲۰)

اے اللہ تعالی تو میرے نفس کو اس کا تقوی (یعنی تقوی کی رہنمائی) عنایت فرما دے اور اس کو پاک کر دے بے شک تو پاک کرنے والوں میں بہترین پاک کرنے والا ہے۔

اگر 'فجور' اور 'تقوی' انسانی فطرت میں داخل ہے تو اللہ تعالی سے اس تقوی کو مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟۔آپ کی یہ دعا اس آیت کے مفہوم کو واضح کر رہی ہے کہ اس آیت میں 'تقوی' سے مراد اس (یعنی تقوی) کی رہنمائی اور 'فجور' سے مراد اس (یعنی فجور) کی پہچان ہے۔

۳)۔ یہ مفہوم صحابہ کی تفسیر کے خلاف ہے۔امام طبری اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کا قول نقل فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

**قوله:فألهمها فجورها و تقواها يقول:بين الخير و الشر**

ابن عباسؓ'' **فألهمها فجورها و تقواها** '' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کے لیے خیر اور شر کو واضح کر دیا ہے۔

۴)۔ یہ مفہوم جلیل القدر تابعین اور تبع تابعین کی تفسیر کے خلاف ہے۔امام طبریؒ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں تابعین و تبع تابعین کے اقوال نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

**عن مجاهد :فألهمها فجورها و تقواها قال:عرفها**

حضرت مجاہدؒ سے روایت ہے کہ '' **فألهمها فجورها تقواها** '' سے مراد یہ ہے اللہ تعالی نے انسان کو گناہ اور تقوی بتلا دیا ہے۔

**عن قتادة :فألهمها فجورها و تقواها فبين لهافجورها**

حضرت قتادہ سے روایت ہے کہ " فألهمها فجورها تقواها " سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کے لیے تقوی اور فجور کو واضح کر دیا ہے۔

**الضحاك يقول في قوله تعالى فألهمها فجورها و تقواها بين لهاالطاعةو المعصية**

حضرت ضحاک فرماتے ہیں کہ " فألهمها فجورها تقواها " سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کے لیے اطاعت اور معصیت کو واضح کر دیا۔

**عن سفيان فألهمها فجورها و تقواها قال أعلمها المعصية و الطاعة**

حضرت سفیان سے روایت ہے کہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو اطاعت اور معصیت کے بارے میں بتلایا۔

جلیل القدر مفسرین امام طبری، امام قرطبی، امام بیضاوی، امام سیوطی، علامہ زمخشری، امام نسفی، امام شوکانی، امام ابن کثیر اور علامہ ابن عطیہ نے بھی اس آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے جو کہ صحابہ اور تابعین کے حوالے سے اوپر بیان ہو چکا ہے۔

فصل پنجم:

# غامدی صاحب کا اپنے اصول فطرت سے انحراف

جس طرح غامدی صاحب کا اصول فطرت غلط ہے اسی طرح بعض مقامات پر اس اصول کی تطبیق میں انھوں نے اپنے ہی وضع کردہ اس اصول سے انحراف بھی کیا ہے۔ان میں سے ایک کو ہم قارئین کے لیے بطور مثال بیان کیے دیتے ہیں۔

مردوں کو اللہ تعالی نے جس فطرت پر پیدا کیا ہے اس میں داڑھی بھی شامل ہے۔کسی چیز کی فطرت سے مراد اس کی وہ اصل تخلیق ہے کہ جس پر اس کو پیدا کیا گیا ہے۔ مردوں کو اللہ تعالی نے جس حالت پر پیدا کیا ہے اس میں یہ بھی ہے کہ ان کے چہرے پر داڑھی کے بال ہوتے ہیں جبکہ عورتوں کو اللہ تعالی نے جس فطرت پر پیدا کیا ہے اس میں یہ ہے کہ ان کے چہرے پر بال نہیں ہوتے۔اللہ تعالی نے مردوں و رعورتوں کی تخلیق میں یہ فطری فرق رکھا ہے۔داڑھی غامدی صاحب کے اصول فطرت سے ثابت ہے۔لیکن غامدی صاحب نے اپنی ہی فطرت اور اپنے اصول فطرت دونوں کی مخالفت اختیار کرتے ہوئے داڑھی کو دین سے خارج قرار دیا۔داڑھی سے متعلق ایک سوال کے جواب میں المورد کے ایک ریسرچ سکالر لکھتے ہیں۔داڑھی انسانی فطرت ہے۔آپ ؐ کا ارشاد ہے:

عشر من الفطرة قص الشارب و اعفاء اللحية و السواك و استنشاق الماء و قص الأظفار و غسل البراجم و نتف الابط و حلق العانة و انتقاص الماء قال زكريا قال مصعب و نسيت العاشرة الا أن تكون المضمضة(۲۱)

دس چیزیں فطرت میں سے ہیں مونچھوں کو کاٹنا' داڑھی کو چھوڑنا' مسواک کرنا' ناک میں پانی چڑھانا' ناخنوں کو کاٹنا' انگلیوں کے جوڑوں کا خلال کرنا' بغل کے بال اکھیڑنا' زیر ناف کے بال مونڈنا' اور استنجا کرنا' زکریا نے کہا کہ مصعب نے کہا کہ میں دسویں چیز بھول گیا اور میرا خیال ہے کہ وہ کلی کرنا ہے۔

اس حدیث میں داڑھی رکھنے کو فطرت قرار دیا گیا ہے۔تمام انبیاء کی داڑھی تھی اس لحاظ سے داڑھی انسانی فطرت ہونے کے ساتھ ساتھ تمام انبیاء کی سنت بھی ہے۔ابن حجرؒ 'فطرت کی تشریح میں امام بیضاوی کا قول نقل کرتے ہیں:

قال هي السنة القديمة التي اختارها الأنبياء و اتفقت عليها الشرائع و كأنها أمر جبلي فطروا عليها (۲۲)

امام بیضاوی کہتے ہیں کہ فطرت سے مراد وہ سنت قدیمہ ہے کہ جسے تمام انبیاء نے اختیار کیا ہے اور جس پر تمام شریعتوں کا اتفاق ہو گویا کہ فطرت ایک ایسا جبلی معاملہ ہے کہ جس پر انسانوں کی پیدائش ہوئی ہے۔

داڑھی سے متعلق ایک سوال کے جواب میں المورد کے ایک ریسرچ سکالر لکھتے ہیں:

عام طور پر اہل علم داڑھی رکھنا ضروری قرار دیتے ہیں' تاہم ہمارے نزدیک داڑھی رکھنے کا حکم دین میں کہیں بیان نہیں ہوا لہذا دین کی رو سے داڑھی رکھنا ضروری نہیں ہے۔البتہ اس معاملے میں اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ اللہ تعالی نے عورتوں کے برعکس مردوں کے چہرے پر بال اگائے ہیں اور یہ کہ نبی ﷺ نے بھی داڑھی رکھنا اپنے لیے پسند کیا۔''(۲۳)

یہ عبارت اس لحاظ سے قابل غور ہے کہ ایک طرف تو اس میں کس ڈھٹائی کے ساتھ اس بات کا دعوی کیا جا رہا ہے کہ داڑھی رکھنے کا حکم دین میں کہیں بھی بیان نہیں ہوا حالانکہ بیسویں احادیث ایسی ہیں کہ جن میں اللہ کے رسول ﷺ نے مشرکین' یہود اور مجوسیوں کی مخالفت میں مسلمانوں کو داڑھی چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔کیا حدیث' دین نہیں ہے ؟۔اگر غامدی صاحب داڑھی کی احادیث کو اس بنا پر رد کر رہے ہیں کہ ان کے نزدیک حدیث سے دین ثابت نہیں ہوتا تو داڑھی تو ان کے اصول سنت سے بھی ثابت ہے اور اصول فطرت سے بھی۔دوسری طرف المورد کے مفتی صاحب اس بات کا بھی اقرار کر رہے ہیں کہ مردوں اور عورتوں میں ایک بنیادی فرق داڑھی کا بھی ہے جو کہ پیدائشی اور فطری فرق ہے۔تعجب ہے اس انداز فکر پر! جب چاہتے ہیں اپنے مزعومہ افکار کی تائید کے لیے اصول وضع کر لیتے ہیں اور اپنی خواہش نفس کی تکمیل کے لیے جب چاہتے ہیں' اپنے ہی وضع کردہ اصولوں کی بھی مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔

## باب اول کے حوالہ جات :


۱)۔ماہنامہ اشراق: مارچ ۲۰۰۴، ص ۱۱

۲)۔میزان، جاوید احمد غامدی، ص ۳۷ تا ۳۹

۳)۔میزان، جاوید احمد غامدی، ص ۴۸ تا ۴۹

۴)۔ماہنامہ اشراق: مارچ ۲۰۰۴، ص ۱۱

۵)۔میزان، جاوید احمد غامدی، ص ۳۷ تا ۳۸

۶)۔میزان، جاوید احمد غامدی، ص ۳۷

۷)۔میزان، جاوید احمد غامدی، ص ۳۸

۸)۔urdu.understanding-islam.org

۹)۔میزان، جاوید احمد غامدی، ص ۳۷

۱۰)۔میزان، جاوید احمد غامدی، ص ۳۸

۱۱)۔میزان، جاوید احمد غامدی، ص ۳۷

۱۲)۔میزان، جاوید احمد غامدی، ص ۳۸ تا ۳۹

۱۳)۔میزان، جاوید احمد غامدی، ص ۴۷

۱۴)۔میزان، جاوید احمد غامدی، ص ۴۸ تا ۴۹

۱۵)۔صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب کون النھی عن المنکر من الایمان

۱۶)۔معروف ومنکر، سید جلال الدین عمری، ص ۹۸ تا ۱۱۳

۱۷)۔صحیح بخاری، کتاب الأطعمۃ، باب الشواء

۱۸)۔صحیح بخاری، کتاب الھبۃ وفضلھا، باب قبول الھدیۃ

۱۹)۔صحیح بخاری مع فتح الباری، کتاب اللباس، باب قص الشارب

۲۰)۔صحیح مسلم، کتاب الذکر و الدعاء، باب التعوذ من شر ما عمل

۲۱)۔صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب خصال الفطرۃ

۲۲)۔صحیح بخاری مع فتح الباری، کتاب اللباس، باب قص الشارب

۲۳)۔urdu.understanding-islam.org

# باب دوم

# علامہ جاوید احمد غامدی کا تصورِ ''سنت''

## فصل اول:

### اہل سنت کے ہاں ''سنت'' کا مفہوم

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر دور اور ہر قوم میں اپنے انبیاء ورسل بھیجے۔ اپنے ان انبیاء اور رسل کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ جاری فرمایا۔ اس وحی کے نزول کے دو طریقے تھے۔

۱) بعض اوقات یہ وحی 'لفظاً' ہوتی تھی یعنی اس میں الفاظ بھی اللہ کے ہوتے ہیں اور معنی بھی اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ 'وحی لفظاً' تحریری صورت میں ہی انبیاء پر نازل ہوتی تھی یا بعد میں اسے تحریری شکل دے دی جاتی تھی۔ وحی لفظاً کی مثالیں صحف ابراہیم تورات، انجیل، زبور اور قرآن وغیرہ ہیں۔

۲) جبکہ اکثر اوقات یہ وحی معناً نازل ہوتی یعنی اس میں الفاظ اللہ کے نہیں ہوتے تھے لیکن پیغام اللہ ہی کی طرف سے ہوتا تھا مثلاً حضرت جبرائیل کا آپ کو نمازوں کے اوقات' اسلام' ایمان' احسان اور قیامت کی علامات کے بارے میں تعلیم دینا، حضرت ابراہیم کو خواب میں اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دینا، اللہ تعالیٰ کا کسی نبی کے دل میں کوئی بات ڈال دینا وغیرہ۔

وحی کی پہلی قسم کو وحی متلو کہتے ہیں یعنی یہ وہ وحی ہے کہ جس کی تلاوت کی جاتی ہے جبکہ وحی کی دوسری قسم کو وحی غیر متلو کہتے ہیں۔ بعض اوقات علماء وحی متلو کو 'وحی جلی' اور وحی غیر متلو کو 'وحی خفی' بھی کہہ دیتے ہیں۔ وحی متلو 'قرآن' ہے جبکہ 'سنت' وحی غیر متلو ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ وحی کی مختلف اقسام کو قرآن میں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

**و ما كان لبشر أن يكلمه الله الا وحيا أو من وراء حجاب أو يرسل رسولا فيوحى باذنه ما يشاء ،انه على حكيم** (الشوری: ۵۱)

اور کسی بشر کے لیے یہ لائق نہیں ہے کہ وہ اللہ سے کلام کرے سوائے کسی اشارے (الہام، خواب اور القاء وغیرہ) کے یا پردے کے پیچھے سے (براہ راست کلام کرنا) یا اللہ تعالیٰ کوئی فرشتہ بھیجے جو اللہ کے حکم سے اس بندے پر جو وہ (اللہ) چاہتا ہے، وحی کرتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ بہت بلند حکمت والا ہے۔

اس آیت میں وحی کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں:

پہلی صورت الہام، خواب یا القاء کی صورت میں کسی نبی پر وحی بھیجنا، اس صورت میں انبیاء کی طرف جو وحی بھیجی جاتی ہے وہ 'وحی معناً' ہوتی ہے۔

وحی کی دوسری قسم جس کو اس آیت مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے وہ پردے کے پیچھے سے اللہ تعالیٰ سے براہ راست کلام کرنا ہے، وحی کی یہ صورت 'وحی لفظاً' ہوتی ہے۔

اسی طرح وحی کی تیسری قسم جو کہ فرشتے کی صورت میں ہوتی ہے وہ بعض اوقات لفظاً ہوتی ہے مثلاً قرآن اور بعض اوقات معناً ہوتی ہے مثلاً حدیث جبرائیل۔

شریعت اسلامیہ میں 'وحی لفظاً' قرآن کی صورت میں جبکہ 'وحی معناً' سنت کی صورت میں محفوظ ہے۔ صحابہ کرام نے وحی کی ان دونوں قسموں کو محفوظ کیا اور امت تک پہنچایا۔ قرآن کی روایت کو 'قرأت' اور سنت کی روایت کو 'حدیث' کہتے ہیں۔ یعنی سنت (وحی خفی) کو جب کوئی صحابی اللہ کے رسول سے اخذ کر کے آگے نقل کرتا ہے تو صحابی کے اس نقل کرنے کو حدیث کہتے ہیں۔ سنت اگر وحی خفی ہے تو حدیث اس وحی کی روایت ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سنت اور حدیث میں کچھ فرق نہیں ہے۔ حدیث میں اللہ کے رسول پر اتاری جانے والی وحی کے حوالے سے جو کچھ بیان ہو رہا ہے وہ سنت ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث کی امہات الکتب میں سے اکثر کے نام سنن سے شروع ہوتے ہیں مثلاً سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ وغیرہ۔

فصل دوم:

# غامدی صاحب کا تصور سنت

غامدی صاحب جس طرح کتاب اللہ اور قرآن میں فرق کرتے ہیں اسی طرح وہ سنت اور حدیث میں بھی فرق کرتے ہیں۔ اپنی کتاب اصول و مبادی میں سنت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ قرآن میں اس کا حکم آپ کے لئے اس طرح بیان ہوا ہے:

**ثم أوحينا اليك أن اتبع ملة ابراهيم حنيفا، و ما كان من المشركين** (النحل ١٦:١٢٣)

پھر ہم نے تمھیں وحی کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یک سو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا۔

اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے، وہ یہ ہے:

۱۔ اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ ۲۔ ملاقات کے موقع پر 'السلام علیکم' اور اس کا جواب۔ ۳۔ چھینک آنے پر 'الحمد للہ' اور اس کے جواب میں 'یرحمک اللہ'۔ ۴۔ نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت۔ ۵۔ مونچھیں پست رکھنا۔ ۶۔ زیر ناف کے بال مونڈنا۔ ۷۔ بغل کے بال صاف کرنا۔ ۸۔ لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ ۹۔ بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ ۱۰۔ ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ ۱۱۔ استنجا۔ ۱۲۔ حیض و نفاس میں زن و شو کے تعلق سے اجتناب۔ ۱۳۔ حیض و نفاس کے بعد غسل۔ ۱۴۔ غسل جنابت۔ ۱۵۔ میت کا غسل۔ ۱۶۔ تجہیز و تکفین۔ ۱۷۔ تدفین۔ ۱۸۔ عید الفطر۔ ۱۹۔ عید الاضحیٰ۔ ۲۰۔ اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ۔ ۲۱۔ نکاح و طلاق اور ان کے متعلقات۔ ۲۲۔ زکوۃ اور اس کے متعلقات۔ ۲۳۔ نماز اور اس کے متعلقات۔ ۲۴۔ روزہ اور صدقہ فطر۔ ۲۵۔ اعتکاف۔ ۲۶۔ قربانی۔ ۲۷۔ حج و عمرہ اور ان کے متعلقات۔

سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے۔ یہ اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے' لہٰذا اس کے بارے میں اب کسی بحث و نزاع کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے دین لا ریب، انہی دو صورتوں میں ہے (یعنی قرآن اور سنت) ان کے علاوہ کوئی چیز دین ہے اور نہ اسے دین قرار دیا جا سکتا ہے۔''(۱)

ہمارے نزدیک غامدی صاحب کا یہ تصور سنت بھی غلط ہے اور اس کے اطلاق میں بھی ان سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ ہم نے اپنی بحث کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں ہم ان کے تصور سنت کی غلطیوں کو واضح کریں گے۔ دوسرے حصے میں ہم سنت کے ذریعہ روایت 'تواتر عملی' پر بحث کریں گے۔ تیسرے حصے میں ہم ان کے اس اصول کی اطلاقی غلطیوں کی نشاندہی کریں گے کہ کہاں کہاں انھوں نے اپنے ہی بنائے ہوئے اصول کی مخالفت کی ہے۔

فصل سوم:

# غامدی صاحب کے تصور سنت کی غلطی

غامدی صاحب کا یہ تصور سنت بوجوہ غلط ہے۔ہم اس تصور سنت کی غلطی پر دو اعتبارات سے بحث کریں گے پہلی بحث میں ہم عقلی، منطقی اور شرعی دلائل کی روشنی میں غامدی صاحب کے تصور سنت کا جائزہ لیں گے۔دوسری بحث میں ہم غامدی صاحب کی کتاب اصول مبادی میں بیان کردہ، ان کے اصولوں کی روشنی میں، ان کے تصور سنت کا جائزہ لیں گے اور اس بات کو واضح کریں گے کہ ان کی اصول و مبادی نامی کتاب درحقیقت تناقضات کا پلندہ ہے کہ جس میں بیان کردہ اصولوں میں سے ہر ایک اصول ان کے کسی دوسرے اصول کا رد کر رہا ہوتا ہے۔

## اہل سنت کی متفق علیہ تعریف کی مخالفت:

جمیع اہل سنت کے نزدیک سنت کی تعریف میں اللہ کے رسول ﷺ کے اعمال کے ساتھ ساتھ آپ کے اقوال اور تقریرات بھی شامل ہیں اسی لیے اصول فقہ کی کتب میں جب علمائے اہل سنت، سنت پر بطور مصدرِ شریعت بحث کرتے ہیں تو سب سنت کے ذیل میں اسی بات کا اثبات کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے اعمال کے علاوہ آپ کے اقوال اور تقریرات بھی مصدرِ شریعت ہونے کی حیثیت سے سنت کی تعریف میں شامل ہیں۔جبکہ غامدی صاحب کے نزدیک اللہ کے رسول ﷺ کے جمیع اقوال اور تقریرات سنت نہیں ہیں۔ان کے نزدیک سنت وہ ہے کہ جس کا تعلق عمل سے ہو۔غامدی صاحب اصول و مبادی میں لکھتے ہیں:

دوسرا اصول یہ ہے کہ سنت کا تعلق تمام تر عملی زندگی سے ہے، یعنی وہ چیزیں جو کرنے کی ہیں''۔(۲)

جس طرح غامدی صاحب اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال اور تقریرات کو سنت نہیں مانتے اسی طرح وہ اللہ کے رسول ﷺ کے جمیع اعمال کو بھی سنت نہیں مانتے۔وہ صرف انہی اعمال کو سنت مانتے ہیں جو عملی تواتر سے امت میں چلے رہے ہوں اور ان کے بارے میں امت میں کوئی اختلاف نہ ہو۔اگر اللہ کے رسول ﷺ کا کوئی عمل حدیث سے ثابت ہو اور تواتر عملی سے ثابت نہ ہو تو وہ عمل بھی ان کے نزدیک سنت نہیں ہے مثلاً رفع الیدین کو وہ اس لیے سنت ماننے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ یہ حدیث سے ثابت ہے پوری امت کا اس پر عمل نہیں ہے۔رفع الیدین سے متعلقہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے غامدی صاحب لکھتے ہیں:

> میرے نزدیک صرف وہی چیز سنت کی حیثیت رکھتی ہیں جو صحابہ کرام کے اجماع سے ہم تک منتقل ہوئی ہوں ہم انھی چیزوں پر اصرار کر سکتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی پر لوگوں کو توجہ بھی دلا سکتے ہیں۔جن امور میں صحابہ کرام کا اجماع نہیں ہے، انہیں نہ سنت کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ ان پر عمل کے لیے اصرار کیا جا سکتا ہے۔میری تحقیق کے مطابق رفع یدین بھی ان چیزوں میں شامل ہے جن پر صحابہ کرام کا اجماع نہ ہو سکا، اس وجہ میں اسے سنت نہیں سمجھتا۔اس کے بعد چاہے ساری دنیا متفق ہو کر اسے سنت قرار دینے لگے تو میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔(۳)

غامدی صاحب کے اس تصور سنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ احادیث میں بیان شدہ اللہ کے رسول ﷺ کی ہزاروں سنن ستائیس اعمال پر مشتمل ایک فہرست تک محدود ہو کر رہ گئیں کہ جس کو غامدی صاحب کے حوالے سے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

## سنت کی تعریف کے ثبوت کا معیار:

غامدی صاحب نے سنت کی تعریف میں یہ لکھا ہے کہ سنت صحابہ کے اجماع سے ثابت ہوتی ہے اور ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پاتی ہے۔

ہم غامدی صاحب کو یہ کہتے ہیں کہ سنت کے ثبوت کی بحث تو بعد میں کریں گے پہلے خود 'سنت کی تعریف' تو صحابہ اور امت کے اجماع سے ثابت کر دیں۔غامدی صاحب کا دعوی ہے کہ کسی چیز کے سنت بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ صحابہ اور امت کے اجماع سے ثابت ہو۔ہم یہ کہتے ہیں اپنی اسی بات پر غامدی صاحب اپنی سنت کی تعریف کو پرکھ لیں، خود غامدی صاحب کی اس بات سے ہی ان کے تصور سنت کا رد ہو رہا ہے۔کیونکہ جب کسی چیز کے سنت بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ صحابہ اور امت کے اجماع سے ثابت ہو تو سنت کی تعریف کے لیے تو بدرجہ اُولی یہ بات ضروری ہونی چاہیے کہ وہ بھی صحابہ اور امت کے اجماع سے ثابت ہو۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ غامدی

صاحب کی بیان کردہ یہ تعریف سنت، نہ تو صحابہ کے اجماع سے ثابت ہے اور نہ امت کے اجماع سے، بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ان کی یہ تعریف، صحابہ کی سنت کی اجماعی تعریف کے خلاف ہے۔جب تعریف سنت ہی اس معیار پر پوری نہیں اتر رہی جو کہ سنت کے ثبوت کے لیے غامدی صاحب نے مقرر کیا ہے تو اگلی بحث کرنا ہی فضول ہے۔

## ذہنی اور فکری انتشار:

الفاظ و معانی کا رشتہ لازم و ملزوم کا ہے۔ہر زبان میں یہ طریقہ کار ہے کہ اہل زبان اپنے احساسات، جذبات، معانی، مفاہیم اور افکار کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے کچھ الفاظ مقرر کرتے ہیں۔اس کو اہل علم یوں تعبیر کرتے ہیں کہ فلاں لفظ کو اہل زبان نے فلاں معانی کے لیے وضع کیا ہے۔جب اہل زبان ایک لفظ ایک خاص معنی یا تصور کی ادائیگی کے لیے متعین کر لیتے ہیں تو لفظ کے اس معنی کو لغوی مفہوم کہتے ہیں۔مثلاً عربی زبان میں لفظ 'اَب' ایک خاص معنی 'باپ' کی ادائیگی کے لیے وضع کیا گیا ہے۔لیکن آج کل کے زمانے میں کوئی عرب شاعر یا ادیب یہ بات کہے کہ میں جب 'اَب' کا لفظ اپنی نثر یا نظم میں استعمال کروں گا تو اس کا معنی میرے نزدیک 'بیٹا' ہو گا تو یہ جائز نہیں ہے۔تمام اہل زبان اس کی مخالفت کریں گے کیونکہ اس سے زبان میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔اسی طرح اہل علم بعض اوقات ان وضع شدہ الفاظ کو اپنے مختلف تصورات کی ادائیگی کے لیے مخصوص کر لیتے ہیں جس کو اصطلاحی مفہوم کہتے ہیں۔لفظ اصطلاح کا مادہ 'صلح' ہے۔یعنی اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ اہل علم یا اہل فن کے ایک طبقے کی اس بات پر صلح ہو گئی ہے کہ آئندہ جب وہ یہ لفظ استعمال کریں گے تو ان کی اس لفظ سے مراد کوئی مخصوص تصور ہو گا۔اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اصطلاح فرد واحد کی نہیں ہوتی بلکہ جماعت کی ہوتی ہے۔فرد واحد کی تعبیر کو شاذ کا نام تو دیا جا سکتا ہے اصطلاح نہیں کہا جا سکتا۔مثلاً علماء نے اس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ جب ہم لفظ 'کتاب اللہ' بولیں گے تو اس سے ہماری مراد قرآن ہو گی۔اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں جب یہ لفظ اپنی تحریروں میں استعمال کروں گا تو اس سے میری مراد کتاب مقدس ہو گی تو یہ جائز نہیں ہے۔کیونکہ اس سے ذہنی اور فکری انتشار پیدا ہوتا ہے۔لفظ سنت کا بھی ایک لغوی مفہوم ہے اور ایک اصطلاحی مفہوم ہے۔جس طرح سنت کے لغوی مفہوم کی مخالفت جائز نہیں اسی طرح سنت کے اصطلاحی مفہوم کی مخالفت کر کے اس سے ایک نیا مفہوم مراد لینا بھی جائز نہیں ہے۔غامدی صاحب نے سنت کا لغوی مفہوم 'پٹے ہوئے راستے' کے کئے ہیں گویا کہ لفظ سنت کا لغوی مفہوم بیان کرتے وقت تو انہوں نے اہل زبان کے ہی بیان کردہ مفہوم کو لیا ہے لیکن جب سنت کی اصطلاحی تعریف بیان کرتے ہیں تو اہل فن کے مقرر کردہ اصطلاحی مفاہیم کو نظر انداز کرتے ہوئے بالکل ایک نیا مفہوم مراد لیتے ہیں۔غامدی صاحب کے حلقہ احباب کے علاوہ اگر امت مسلمہ کے کسی فرد سے یہ سوال کیا جائے کہ سنت سے کیا مراد ہے یا جب لفظ سنت بولتے ہیں تو اس وقت تمہارے ذہن میں کیا تصور اجاگر ہوتا ہے تو اس کا جواب یقیناً یہی ہو گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے جمیع اعمال، اقوال اور تقریرات یا آپ کی ساری زندگی۔خلاصہ کلام یہ کہ جب بھی لفظ 'سنت' استعمال ہوتا ہے تو اس وقت ہر مسلمان کے ذہن میں ایک ہی تصور آتا ہے اور وہ محمد ﷺ کا تصور ہوتا ہے نہ کہ حضرت ابراہیم کا، اور سنت کا یہ اصطلاحی تصور اتنا عام ہو گیا ہے کہ وہ اس کے لغوی تصور پر بھی غالب آ گیا ہے اس لیے اس کی مخالفت جائز نہیں ہے۔اگر اصطلاحی مفاہیم کی مخالفت جائز ہے تو پھر یہ صرف غامدی صاحب کے لیے جائز نہیں بلکہ ہر کسی کے لیے جائز ہے۔اگر کل کو کوئی یہ کہے کہ ''سنت سے میری مراد دین آدم کی وہ روایت ہے...'' تو یہ بھی جائز ہو گا اور کوئی دوسرا یہ کہے کہ ''سنت سے میری مراد دین موسوی کی وہ روایت ہے...'' تو یہ بھی جائز ہو گا۔اور اس سے امت مسلمہ کو سوائے ذہنی اور فکری انتشار کے کچھ حاصل نہ ہو گا۔اس طرح ہر آدمی سنت کا اپنا مفہوم لے کر بیٹھا ہو گا اور زبان کا جو مقصد تھا کہ الفاظ کو استعمال کر کے دوسروں تک اپنے تصورات کو پہنچانا، وہ مقصد فوت ہو جائے گا۔

## علمی دیانت کا تقاضا:

اگر غامدی صاحب یہ کہتے ہیں کہ ہم سے پہلے اہل علم حضرات نے اگر ایک لفظ کو ایک خاص تصور کی ادائیگی کے لیے بطور اصطلاح کے مقرر کر لیا تھا تو ہمارے پاس بھی یہ حق ہے کہ ہم بھی اپنے لیے اصطلاحات وضع کریں، ہم اس کا انکار نہیں کرتے۔غامدی صاحب اپنے تصورات کی ادائیگی کے لیے ضرور اصطلاحات بنائیں لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ غامدی صاحب اپنے تصورات اور اپنی مراد واضح کرنے کے لیے سلف صالحین کی اصطلاحات استعمال نہ کریں۔ہوتا یہ ہے کہ غامدی صاحب کی مراد تو اپنی ہوتی ہے اور اس کے لیے اصطلاحات علماء کی استعمال کر لیتے ہیں جس سے مغالطے پیدا ہوتے ہیں۔اب سنت کا لفظ اہل علم میں، اللہ کے رسول ﷺ کے حوالے سے مخصوص ہے۔اب اگر غامدی صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ سنت کا تعلق دراصل حضرت ابراہیم سے ہے تو انہیں چاہیے کہ اپنے اس تصور کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے کوئی نئی اصطلاح

وضع کریں۔لفظ 'سنت' کو استعمال نہ کریں۔جب کچھ الفاظ اصطلاحی طور پر ایک خاص تصور کی ادائیگی کے لیے مخصوص ہو جائیں تو ان الفاظ کو استعمال کر کے اپنی مرضی کا مفہوم مراد لینا علمی خیانت ہے۔اب ہوتا یہ ہے کہ علماء کی طرف سے غامدی صاحب پر یہ تنقید ہوتی ہے کہ غامدی صاحب سنت کو نہیں مانتے ہیں تو جواب میں غامدی صاحب یہ کہتے ہیں کہ ہم تو سنت کو مآخذ دین میں شمار کرتے ہیں اور سنت سے ان کی مراد وہ ستائیس چیزیں ہیں جنہیں ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔خلاصہ کلام یہ ہے کہ غامدی صاحب کو چاہیے کہ جب بھی وہ لکھیں یا بات کریں تو یوں نہ کہیں کہ 'ہمارے نزدیک اصل دین قرآن اور سنت ہے' بلکہ وہ یوں کہیں کہ ہمارے نزدیک 'اصل دین قرآن اور سنت ابراہیمی ہیں'۔کیونکہ لفظ سنت، محمد ﷺ کے تصور کے حوالے سے امت مسلمہ میں رائج ہو چکا ہے اس لیے مجرد اس لفظ کو استعمال کر کے حضرت ابراہیم کا تصور مراد لینا صحیح نہیں ہے۔

## غامدی صاحب کی بیان کردہ سنن کا حضرت ابراہیم سے ثبوت:

غامدی صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ کے نزدیک سنت وہ ہے جس کا منبع حضرت ابراہیم ہوں۔آپ نے جن ستائیس سنن کو بیان کیا ہے پہلے ان کو حضرت ابراہیم تک تواترِ عملی سے ثابت تو کریں۔کیونکہ خود آپ کے بیان کردہ اصول کے مطابق سنت خبر سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ تواترِ عملی سے ثابت ہوتی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ کسی شے کو اُخذ کرنے کا ذریعہ یا تو براہ راست مشاہدہ ہے یا بالواسطہ مشاہدہ۔یہ بات تو واضح ہے کہ غامدی صاحب نے اپنی بیان کردہ سنن کا حضرت ابراہیم سے براہ راست مشاہدہ نہیں کیا، رہی دوسری صورت یعنی بالواسطہ مشاہدہ تو اس کا ذریعہ خبر ہے۔غامدی صاحب خبر سے ثابت کر دیں کہ یہ حضرت ابراہیم کی سنن ہیں تو پھر ہم بھی مان لیں گے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ غامدی صاحب خبر کے ذریعے بھی حضرت ابراہیم کی طرف اپنی بیان کردہ سنن کی فہرست کینسبت ثابت کرنے سے عاجز اور قاصر ہیں۔غامدی صاحب نے یہ لکھ تو دیا ہے کہ سنت کا منبع وسرچشمہ حضرت ابراہیم ہیں اور سنت تواترِ عملی سے ثابت ہوتی۔لیکن ہمیں حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ حضرت ابراہیم کی طرف ان اعمال کی نسبت تواترِ عملی سے کیسے ثابت کریں گے؟ چلیں تواترِ عملی نہ سہی خبرِ صحیح سے ثابت کر دیں کہ ان اعمال کو حضرت ابراہیم نے بطور دین جاری کیا۔جب تک غامدی صاحب اپنی بیان کردہ سنن کی فہرست کے بارے میں یہ ثابت نہ کر دیں کہ ان اعمال کو حضرت ابراہیم نے دین کی حیثیت جاری کیا، اس وقت تک اس بات کا کوئی جواز نہیں بنتا کہ وہ ان اعمال کو دین ابراہیمی کی روایت کے نام سے پیش کریں۔کیونکہ یہ اعمال ان کی تعریف کے مطابق اسی وقت سنت بنیں گے جب ان کی نسبت حضرت ابراہیم سے صحیح ثابت ہو جائے۔اور حضرت ابراہیم کی طرف ان اعمال کی نسبت صحیح ثابت کرنے کا واحد ذریعہ اب ان کے پاس خبر ہے اور خبر سے ان کے نزدیک سنت ثابت نہیں ہوتی بلکہ سنت تو ان کے نزدیک تواترِ عملی سے ثابت ہوتی ہے۔غامدی صاحب کی بیان کردہ سنن کی نسبت حضرت ابراہیم سے ثابت کرنا تقریباً ناممکن ہے۔جب کسی عمل کے بارے میں یہ ثابت کرنا ہی ممکن نہیں ہے کہ ان اعمال کو حضرت ابراہیم بطور دین جاری کیا اس وقت تک کسی عمل کے بارے میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ سنت ابراہیمی ہے۔صرف تین اعمال ایسے ہیں کہ احادیث میں جس کی نسبت حضرت ابراہیم کی طرف کی گئی ہے ایک قربانی کا عمل ہے۔حدیث میں قربانی کے عمل کے بارے میں یہ الفاظ ہیں:

**سنة أبيكم ابراهيم (۴)**

یہ تمھارے باپ ابراہیم کی سنت ہے۔

لیکن یہ روایت بھی ضعیف ہے اس کی سند میں دو راوی 'عائذ اللہ' اور 'ابوداؤد' ضعیف راوی ہیں بلکہ 'ابوداؤد' کو تو بعض ائمہ جرح و تعدیل نے کذاب بھی کہا ہے۔

دوسرا عمل جس کی حضرت ابراہیم کی طرف نسبت کی گئی ہے، ختنہ ہے اور تیسرا مونچھوں کا تراشنا ہے مؤطا امام مالک کی ایک روایت ہے:

**عن سعيد ابن المسيب أنه قال كان ابراهيم أول الناس ضيف الضيف و أول الناس اختتن وأول الناس قص الشارب (۵)**

حضرت سعید بن مسیّب سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا حضرت ابراہیم وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مہمان نوازی کی، اور ختنہ کیا اور مونچھوں کو تراشا۔

لیکن یہ روایت مقطوع ہے علاوہ ازیں ان صحیح روایات کے بھی خلاف ہے کہ جن میں آپ نے ختنے اور مونچھوں کے تراشنے کو انسانی فطرت قرار دیا ہے۔ہم یہاں یہ بھی واضح کر دیں کہ غامدی صاحب کے تصور سنت کا اصل مأخذ ڈاکٹر جواد علی کی کتاب 'المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام' ہے۔ہم تو یہ کہتے ہیں کہ غامدی صاحب کے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اس کتاب کو ہی بنیاد بنا کر اپنی بیان کردہ ستائیس سنتوں کو دین ابراہیمی کے شعائر کے حیثیت سے ثابت کر سکیں۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غامدی صاحب کی تعریف سنت، مجرد تعریف ہی ہے اس کا کوئی مسمی نہیں ہے کہ جس پر اس تعریف کا اطلاق کیا جا سکے۔ اگر غامدی صاحب یہ دعوی کرتے ہیں کہ جو ستائیس چیزیں ہم نے بیان کی ہیں وہ اس تعریف کا مسمی ہیں تو ہم ان سے یہ سوال کریں گے کہ پہلے کسی شرعی دلیل سے ثابت تو کیجئے کہ ان اعمال کا منبع حضرت ابراہیم ہیں، اہل سنت کے شرعی دلائل سے نہ سہی اپنے مزعومہ شرعی دلائل سے ہی ثابت کر دیں کہ ان اعمال کا آغاز حضرت ابراہیم سے ہوا ہے۔ اس فہرست میں بیان کردہ تمام اعمال نہ سہی کچھ کے بارے میں تو ثابت کر دیں کہ ان کو حضرت ابراہیم نے جاری کیا۔

## سنت کی تعریف میں حضرت ابراہیم کے تذکرے کی تاریخی حیثیت:

غامدی صاحب یہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنت کی تعریف میں حضرت ابراہیم کا تذکرہ ایک تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کیا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ تاریخی حقیقت تو یہ کہتی ہے کہ غامدی صاحب کو سنت کی تعریف میں حضرت ابراہیم کی بجائے حضرت آدم کا نام شامل کرنا چاہیے۔ غامدی صاحب کی بیان کردہ اکثر و بیشتر سنن وہ ہیں جو کہ حضرت آدم کے زمانے سے چلی آ رہی ہیں۔ مثلا غامدی صاحب کی بیان کردہ دو سنن قربانی اور تدفین کو ہی لے لیں۔ ان سنن کی تاریخی اس بات کی طرف تو اشارہ کرتی ہے کہ ہم ان سنن کی نسبت حضرت آدم کی طرف کریں، قرآن کے مطابق قربانی اور تدفین کی سنن کی ابتدا حضرت آدم کے زمانے ہی سے ہو گئی تھی۔ قرآن میں حضرت آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:

**اذ قربا قربانا فتقبل من احدھما و لم یتقبل من الأخر** (المائدہ:۲۷)

جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں ایک کی قربانی قبول کی گئی اور ایک کی قربانی قبول نہیں کی گئی۔

اسی طرح آگے یہ ذکر بھی موجود ہے کہ جب نوع انسانی میں پہلا قتل ہوا اس وقت سے تدفین کی ابتدا ہوئی۔ ارشاد باری تعالی ہے:

**فبعث اللہ غرابا یبحث فی الارض لیریہ کیف یواری سوءۃ أخیہ قال یویلتی أعجزت أن أکون مثل ھذا الغراب فأواری سوءۃ أخیہ فأصبح من الندمین** (المائدہ:۳۱)

پھر اللہ تعالی نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تا کہ اسے بتائے کہ کیسے وہ اپنے بھائی کی لاش کو چھپائے اس نے کہا افسوس مجھ پر! کہ میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ میں اپنے بھائی کی لاش کو چھپا تا، تو وہ ہو گیا ندامت کرنے والوں میں سے۔

ان آیات سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ قربانی اور تدفین، سنت ابراہیمی نہیں، بلکہ سنت آدم ہیں۔ اسی طرح غامدی صاحب کا نکاح وطلاق، نماز، زکوۃ، روزہ، حج، حیض ونفاس میں زن وشو کے تعلق سے اجتناب، حیض ونفاس کے بعد غسل، غسل جنابت اور اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ کرنے کو سنت ابراہیم کہنے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ معاذ اللہ حضرت ابراہیم سے پہلے انبیاء میں زن وشو کے تعلقات کے لئے نکاح وطلاق کا کوئی تصور نہ تھا، حیض ونفاس کی حالت میں انبیاء اپنی بیویوں سے مباشرت کرتے اور مباشرت کے بعد غسل کا بھی کوئی حکم ان کی شریعت میں موجود نہ تھا۔ حضرت ابراہیم سے پہلے گزر جانے والے انبیاء کی امتوں میں جانوروں کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہیں لیا جاتا تھا اور نہ ہی حیض ونفاس کے بعد عورتیں غسل کرتی تھیں مزید برآں پچھلے انبیاء میں نہ نماز تھی نہ روزہ نہ حج نہ زکوۃ، اگر یہ سب کچھ پچھلے انبیاء کی شریعتوں میں نہیں تھا تو پھر ان کی شریعت کیا تھی؟ جس کے بارے میں قرآن نے ہمیں حکم دیا ہے:

**قل أمنا باللہ و ما انزل علیناو ما انزل علی ابراھیم و اسمعیل و اسحق و یعقوب والاسباط و ما أوتی موسی و عیسی و النبیون من ربھم** (آل عمران:۸٤)

آپ کہہ دیں کہ "ہم اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور جو شریعت ہم پر نازل کی گئی اس کو بھی مانتے ہیں اور جو حضرت ابراہیم، حضرت اسمعیل، حضرت اسحق، حضرت یعقوب، اولاد یعقوب پر نازل کی گئی اس کو بھی مانتے ہیں اور جو شریعت حضرت موسی اور حضرت عیسی کو دی گئی اس کو بھی مانتے ہیں اور جو ان کے علاوہ دوسرے انبیاء کو دی گئی اس کو بھی مانتے ہیں۔

ہماری اس تنقیح پر اگر غامدی صاحب یہ کہتے ہیں کہ ان احکامات کے بارے میں ہمارا بھی نکتہ نظر یہی ہے کہ یہ احکامات حضرت ابراہیم سے ماقبل شریعتوں میں بھی موجود تھے تو پھر غامدی صاحب کی یہ بیان کردہ سنن، سنن ابراہیمی نہ رہیں گی بلکہ سنن آدم ہوں گی۔ غامدی صاحب کو چاہیے جس عمل کی ابتدا جس نبی سے پہلی مرتبہ ثابت ہورہی ہے اس عمل کی نسبت اسی نبی کی طرف کریں اور اس کو اس نبی کی سنت کے نام سے پیش کریں پھر دیکھیں کہ حضرت ابراہیم کے حوالے سے جوانہوں نے سنن بیان کی ہیں ان میں سے کتنی ایسی ہیں جو کہ ان کی تعریف سنت کا صحیح مصداق بنتی ہیں۔

## کیا سنت وحی ہے؟:

آخر میں ہم غامدی صاحب سے سوال کرتے ہیں کیا آپ، اپنی سنت (ستائیس چیزوں) کو وحی شمار کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر غامدی صاحب یہ جواب دیتے ہیں اور یقیناً ان کا جواب بھی یہی ہوگا کہ ہمارے نزدیک سنت (ستائیس چیزیں) وحی نہیں ہے تو پھر ہمارا سوال ہے کہ جب آپ کے نزدیک آپ کی سنت وحی نہیں ہے تو پھر وہ دین کیسے بن گئی؟؟؟ اگر غامدی صاحب یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سنت (ستائیس چیزیں) وحی ہے تو ہم یہ سوال کریں گے کہ اس کی دلیل کیا ہے کہ یہ وحی ہیں؟ اور یہ وحی کس پیغمبر پر اتری تھی؟ پھر اس کی دلیل کیا ہے کہ یہ فلاں پیغمبر پر اتری تھی؟۔

فصل چہارم:

# غامدی صاحب کے اصول سنت کی دلیل کا جائزہ

غامدی صاحب نے اپنی بیان کردہ تعریف سنت کے ثبوت کے لیے سورۃ النحل کی درج ذیل آیت کو بطور دلیل بیان کیا ہے:

**ثم أوحينا اليك أن اتبع ملة ابراهيم حنيفا و ما كان من المشركين**(النحل :١٢٣)

پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ آپ حضرت ابراہیم کی ملت کی پیروی کریں جو بالکل یکسو تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔

غامدی صاحب بحث سنت کی کر رہے ہیں اور دلیل ایک ایسی آیت کو بنا رہے ہیں جس میں لفظ 'ملت' استعمال ہوا ہے حالانکہ یہاں پر 'ملت ابراہیم' سے مراد بالکل بھی سنت ابراہیمی (وہ ستائیس چیزیں جو کہ غامدی صاحب نے بیان کی ہیں) نہیں ہے۔ ملت کا لفظ قرآن میں معمولی سے فرق کے ساتھ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں 'ملت ابراہیم' سے مراد دین اسلام کی وہ اساسی تعلیمات جو کہ حضرت ابراہیم کی شخصیت میں نمایاں تھیں یعنی ہر قسم کے شرک سے اجتناب کرنا اور اللہ کا انتہائی درجے میں فرمانبردار ہو جانا۔ ہماری اس تفسیر کی تائید درج ذیل قرائن سے ہو رہی ہے:

۱) شرک سے اجتناب اور اللہ کی فرمانبرداری، یہ حضرت ابراہیم کی وہ امتیازی خصوصیات ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ باقی تمام پیغمبروں میں نمایاں ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت ابراہیم کی قرآن میں جہاں بھی مدح بیان کی گئی ہے انہی دو اوصاف کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔

۲) ملت ابراہیم کا یہ مفہوم نظم قرآن سے بھی واضح ہو رہا ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں اس آیت میں بھی اور اس کے علاوہ بھی قرآن میں جہاں کہیں حضرت ابراہیم کی ملت کی اتباع کا حکم ہے، وہاں یہ حکم شرک کے بالمقابل یا اطاعت کے پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے بیان کیا گیا۔ جیسا کہ درج ذیل آیات سے واضح ہو رہا ہے:

١) **و قالوا كونوا هودا أو نصارى تهتدوا قل بل ملة ابراهيم حنيفا و ما كان من المشركين** (البقرة :١٣٥)

اس آیت میں اللہ کے رسول ﷺ کو کہا گیا کہ آپ ان یہود و نصاری سے کہہ دیں کہ ہم تو حضرت ابراہیم کی پیری کرتے ہیں جو کہ یکسو تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔ یعنی ان کو بتا دیں کہ ہم تو دین ابراہیمی پر ہیں۔ اور دین ابراہیمی کیا ہے؟ اللہ کے بارے میں یکسو ہو جانا اور اس کے ساتھ شرک نہ کرنا۔

٢) **قل صدق الله فاتبعوا ملة ابراهيم حنيفا و ما كان من المشركين**(آل عمران :٩٥)

اس آیت میں بھی یہودیوں سے خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ اپنی بدعات (مثلاً اونٹ کے گوشت کو حرام قرار دینا وغیرہ) کو دین ابراہیم کے نام سے پیش نہ کرو بلکہ حضرت ابراہیم کے اس دین کی پیروی کرو جو کہ بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ اللہ کے لیے یکسو ہو جاؤ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

٣) **و من أحسن دينا ممن أسلم وجهه لله و هو محسن و اتبع ملة ابراهيم حنيفا** (النساء :١٢٥)

اس آیت مبارکہ میں اہل کتاب اور مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تمہاری خواہشات سے کچھ نہیں حاصل ہوگا۔ اصل چیز عمل ہے اور سب سے اچھا دین اس کا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو اللہ کے احکامات کے سامنے اس طرح جھکا دیا جیسا کہ حضرت ابراہیم نے جھکا دیا تھا اور اللہ کے معاملے میں یکسو ہو گئے۔ حضرت ابراہیم کا اصل دین نہ یہودیت تھا اور نہ عیسائیت بلکہ ان کا اصل 'دینِ اسلام' اللہ کی فرمانبرداری اور اطاعت تھا۔ اس لیے جو اللہ کا مطیع اور فرمانبردار ہے اور اللہ کے ساتھ شریک نہیں کرتا وہ دین ابراہیمی پر ہے اور جو اللہ کا مطیع اور فرمانبردار نہیں ہے اور اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو وہ دین ابراہیم پر نہیں ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

**ما كان ابراهيم يهوديا و لا نصرانيا و لكن كان حنيفا مسلما و ما كان من المشركين**(آل عمران:٦٦)

٤) **قل انني هداني ربي الى صراط مستقيم دينا قيما ملة ابراهيم حنيفا و ما كان من المشركين** (الأنعام:١٦١)

اس آیت میں اللہ کے رسول ﷺ کو کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی سیدھے راستے یعنی دین قیم کی رہنمائی فرمائی ہے اور دین قیم سے مراد ملت ابراہیمی ہے یعنی اللہ کے لیے یکسو ہو جانا اور اس کے ساتھ شرک نہ کرنا۔

**و اتبعت ملة آباء ی ابراهیم و اسحق و یعقوب ما کان لنا ان نشرك بالله من شیء** (یوسف:۳۸)

اس آیت مبارکہ میں حضرت یوسف اپنے جیل کے ساتھیوں کو تبلیغ کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ میں نے ان لوگوں کے دین کو اختیار نہیں کیا جو کہ اللہ کو نہیں مانتے اور آخرت کا بھی انکار کرتے ہیں بلکہ میں اپنے آباؤ اجداد کے دین پر ہوں جو کہ اللہ کو بھی مانتے تھے اور آخرت کو بھی، اور ہمارے لیے جائز نہیں ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی قسم کا شرک کریں۔

۵) **و من یر غب عن ملة ابراهیم الا من سفه نفسه و لقد اصطفیناه فی الدنیا و انه فی الآخره لمن الصالحین اذ قال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العلمین** (البقرة : ۱۳۰)

'**و من یرغب عن ملة ابراهیم الا من سفه نفسه**'' سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر ہم ملت ابراہیم کی اتباع سے جزئیات میں ان کی اتباع مراد لے لیں تو اس کا مطلب ہوگا کہ جن انبیاء نے جزئیات میں حضرت ابراہیم کی اتباع نہیں کی معاذ اللہ وہ بے وقوف ہیں۔حضرت ابراہیم کی ملت کی اتباع سے مراد یہاں بھی، ان کے اس رویے کی پیروی ہے جو انہوں نے اللہ کی اطاعت کے معاملے میں پیش کیا یعنی اللہ کے لیے انتہائی درجے میں فرمانبرداری اختیار کرنا۔آگے جا کر اسی کو 'الدین' کہا گیا ہے کیونکہ دین بھی دراصل اطاعت ہی کو کہتے ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

**و وصی بها ابراهیم بنیه و یعقوب یبنی ان الله اصطفی لکم الدین فلاتموتن الا و أنتم مسلمون** (البقرة:۱۳۲)

چونکہ دین بھی اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کو کہتے ہیں جیسا کہ '**ولا تموتن الا و انتم مسلمون**' سے ظاہر ہو رہا ہے۔اسی لیے اکثر مفسرین نے ملت کا ترجمہ دین یعنی اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کیا ہے۔

۶) **ملة أبیکم ابراهیم هو سمکم المسلمین** (الحج:۷۸)

اس آیت میں بھی ملت ابراہیمی کی اتباع کے ساتھ ساتھ اللہ کی فرمانبرداری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

۷) **ثم أوحینا الیك أن اتبع ملة ابراهیم حنیفا و ما کان من المشرکین** (النحل :۱۲۳)

اس آیت کے سیاق وسباق سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ملت ابراہیمی کی اتباع سے مراد اللہ کے معاملے میں یکسو ہو جانا اور شرک نہ کرنا ہے۔ان سب آیات کا سیاق وسباق یعنی نظم قرآنی اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ ملت ابراہیمی کی اتباع سے مراد ہر قسم کے شرک سے اجتناب اور اللہ کے لیے انتہائی درجے میں فرمانبردار ہو جانے میں حضرت ابراہیم کے اسوہ کی پیروی کرنا ہے۔ ۳) اسی معنی کو جلیل القدر مفسرین مثلاً امام طبری، امام قرطبی وغیرہ نے اپنی تفاسیر میں اختیار کیا ہے۔

۴) غامدی صاحب کی تعریف کے مطابق سنت اعمال کا نام ہے اور عقیدہ اس میں شامل نہیں ہوتا۔جبکہ قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ملت میں عقیدہ بھی شامل ہے' جیسا کہ درج ذیل آیت سے معلوم ہو رہا ہے۔

**أجعل الآلهة الها واحدا ان هذا لشیء عجاب و انطلق الملأ منهم أن امشوا و اصبروا علی آلهتکم ان هذا لشیء یراد ما سمعنا بهذا فی الملة الآخره ان هذا الا اختلاق** (ص: ۵تا۷)

۵) لفظ ملت کا ترجمہ 'دین' تو کیا جا سکتا ہے (جیسا کہ امام راغب اصفہانی نے المفردات میں' ابن الاثیر الجزری نے النھایہ میں، علامہ ابن الجوزی نے تذکرۃ الأریب میں، ابن المنظور الافریقی نے لسان العرب میں اور ابوبکر السجستانی نے غریب القرآن میں لکھا ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ دین کا اصل معنی بھی اطاعت اور فرمانبرداری ہی ہے، لیکن ملت کا ترجمہ 'سنت' کسی طرح نہیں بنتا۔

۵) اگر ملت ابراہیمی سے مراد وہ ستائیس اعمال لے بھی لیے جائیں جو کہ غامدی صاحب بیان کر رہے ہیں تو پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین ابراہیمی کی بنیادی عبادات نماز اور مناسک حج وغیرہ بھی محفوظ نہ تھیں چہ جائیکہ کہ باقی اعمال محفوظ رہیں ہوں۔جب دینِ ابراہیمی ہی محفوظ نہ تھا تو اللہ تعالی کا اپنے رسول ﷺ کو اس کی اتباع کا حکم دینا کچھ معنی نہیں رکھتا۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ملت اور سنت میں فرق ہے۔لفظ ملت کا ترجمہ 'سنت' سے کرنا عربی زبان سے لاعلمی اور قرآنی اصطلاحات سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

فصل پنجم:

# غامدی صاحب کے اصولِ سنت کا ردّ
# ان کے اپنے اصولوں کی روشنی میں

غامدی صاحب نے استنجا کرنا، بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا، ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی' مونچھیں پست رکھنا، زیر ناف کے بال مونڈنا اور بغل کے بال صاف کرنے کو سنت ابراہیمی میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے یہ چیزیں انسانی فطرت میں شامل ہیں ان کی نسبت حضرت ابراہیم کی طرف کرنے کا مطلب یہ بنتا ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے لوگوں کے ہاں نہ تو کسی قسم کے استنجے کا تصور تھا، نہ ہی وہ اپنی مونچھیں پست رکھتے، نہ زیر ناف کے بال مونڈتے، نہ بغل کے بال صاف کرتے، نہ ناک منہ اور دانتوں کی صفائی کرتے تھے۔ یہ تصور قطعاً غلط ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے جسم کی صفائی سے متعلقہ یہ سارے احکامات فطرت انسانی کا حصہ ہیں۔ آپ کی حدیث ہے:

**الفطرة خمس أو خمس من الفطرة الختان و الاستحدادو نتف الابط و تقليم الأظافر و قص الشارب**ؐ()

فطرت پانچ چیزیں ہیں یا پانچ چیزیں فطرت میں سے ہیں، ختنہ کرنا، زیر ناف کے بال مونڈنا، بغل کے بال اکھیڑنا، ناخنوں کو کاٹنا، اور مونچھوں کو پست کرنا

اس کے علاوہ علماء بھی جب ان احکامات کو بیان کرتے ہیں تو 'سنن الفطرۃ' کے نام سے بیان کرتے ہیں' مثلاً السید سابق اپنی کتاب 'فقہ السنۃ' اور شیخ محمد بن ابراہیم التویجری اپنی کتاب 'مختصر الفقہ الاسلامی' میں اس بحث کو اسی عنوان کے تحت لے کر آئے ہیں۔ پس ثابت ہو گیا کہ یہ اعمال انسانی فطرت کا حصہ ہیں لہذا ان اعمال کی نسبت حضرت ابراہیم کی طرف کرنا، صحیح نہیں ہے۔ بلکہ غامدی صاحب کو چاہیے کہ ان اعمال کو 'سنت ابراہیمی' کے تحت بیان کرنے کی بجائے اپنے اصول 'دین فطرت کے حقائق' کے تحت بیان کریں۔ غامدی صاحب کے بیان کردہ اصول فطرت کے بھی یہ بات خلاف ہے کہ ان اعمال کی نسبت حضرت ابراہیم کی طرف کی جائے۔ غامدی صاحب اصول و مبادی میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''پانچواں اصول یہ ہے کہ وہ چیزیں جو محض بیان فطرت کے طور پر آئی ہیں، وہ بھی سنت نہیں ہیں''۔(۷)

غامدی صاحب کے اس اصول سے ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک فطرت کی بنیاد پر ثابت شدہ اعمال کو سنن کہنا صحیح نہیں ہے اور یہاں وہ خود اپنے اس بنائے ہوئے اصول کی مخالفت کر رہے ہیں اور جسم کی صفائی کے احکامات جو کہ بیان فطرت ہیں ان کو بیان سنت بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ اس سے ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ کسی طرح اپنی تعریفِ سنت کے ثبوت کے لیے کھینچ تان کر کوئی مسمی نکال لائیں۔

علاوہ ازیں غامدی صاحب نے قرآن پر تدبر کے جو اصول بیان کئے ہیں ان میں پہلا اصول 'عربی معلّٰی' ہے۔ جس کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اہل زبان کے محاورہ کی مخالفت جائز نہیں ہے اور قرآن جن پر نازل ہوا اسے انہی کی زبان کے محاورے میں سمجھنا چاہیے۔ غامدی صاحب کے نزدیک جب قرآن، جو کہ دین ہے اور قطعی الدلالۃ ہے، اس پر تدبر کے لیے اہل زبان کے محاورے کی پابندی ضروری ہے تو سنت جو کہ قرآن ہی کی طرح دین ہے اور قطعی الدلالۃ ہے اور اس پر مزید یہ کہ وہ قرآن سے بھی پہلے ہے (جیسے کی غامدی صاحب بھی کہتے ہیں)، تو اس کو سمجھنے کے لیے اہل زبان (صحابہ کرام) کے محاورے کی پابندی کیوں ضروری نہیں۔ تصور سنت کی تفہیم میں خود غامدی صاحب اہل زبان کے محاورے کی مخالفت کر رہے ہیں۔ بیسویں اُحادیث ایسی ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل زبان (صحابہ کرام) کے محاورے میں سنت سے مراد اللہ کے رسول ﷺ کی سنت ہے نہ کہ حضرت ابراہیم کی، جبکہ غامدی صاحب نے اہل زبان (صحابہ کرام) کے محاورے کے برعکس سنت کے مفہوم میں حضرت ابراہیم کا تصور بھی ڈال دیا۔

فصل ششم:

# غامدی صاحب اور تواتر عملی

اہل سنت کے نزدیک سنت سے مراد وحی خفی ہے اور اس کی روایت حدیث کہلاتی ہے۔ یعنی اس سنت کے ہم تک پہنچنے کا ذریعہ 'حدیث' ہے، جبکہ غامدی صاحب کے نزدیک سنت وہ ستائیس چیزیں ہیں جن کی فہرست ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اور یہ سنت ہم تک تواتر عملی سے پہنچی ہے۔ ہمارے نزدیک غامدی صاحب کے تصور تواتر عملی میں درج ذیل غلطیاں ہیں۔

## غامدی صاحب نے لوگوں کو شارع بنا دیا:

غامدی صاحب کے نزدیک اللہ کے رسول ﷺ کا وہ عمل جو کہ تواتر عملی سے ہم تک پہنچا ہو، وہ سنت ہے، اور سنت دین ہے، گویا کہ ان کے نزدیک تواتر عملی سے ایک عمل دین بن جاتا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کا ایک دوسرا عمل جو تواتر عملی سے منقول نہ ہو بلکہ خبر واحد سے مروی ہو، وہ دین نہیں ہے۔ غامدی صاحب کے نزدیک اللہ کے رسول ﷺ کے کسی عمل کے دین بننے میں اصل حیثیت تواتر عملی کی ہے۔ گویا یہ تواتر عملی ہی ہے جو کہ آپ کے کسی عمل کو دین بنا دیتا ہے اور کسی دوسرے عمل کو دین نہیں بناتا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جب آپؐ کے کسی عمل کے دین بننے کے لیے اصل معیار تواتر عملی ٹھہرا تو معاذ اللہ تواتر عملی کی حیثیت آپؐ سے بڑھ کر ہو گئی جو اللہ کے رسول ﷺ کے بعض اعمال کو دین بنا دیتا ہے اور بعض کو دین نہیں بناتا، نتیجۃً اصل شارع تو لوگ ہوئے، نہ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ۔ اللہ کے رسول ﷺ کے جس عمل کو لوگوں نے تواتر سے نقل کر دیا وہ دین بن گیا اور جس عمل کو تواتر سے نقل نہ کیا وہ دین نہ بن سکا، یعنی اصل حیثیت اللہ کے رسول ﷺ کے اعمال کی نہیں ہے بلکہ اصل حیثیت لوگوں کے آپؐ کے اعمال پر عمل کی ہے۔ آپؐ کے جس عمل پر لوگوں نے تواتر سے عمل کیا ہے وہ دین ہے اور جس پر تواتر سے عمل نہیں کیا وہ دین نہیں ہے۔

## دین اور ذریعے میں فرق:

دین اور چیز ہے اور اس کو آگے نقل کرنے کے ذرائع اور چیز ہیں۔ دونوں میں فرق ہے۔ دین کو روایت اور نقل کرنے کے ذرائع، نہ تو دین ہیں اور نہ ان کو کسی چیز کے دین قرار دینے کے لیے معیار بنایا جا سکتا ہے۔ تواتر عملی دین کو پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے نہ کہ کسی چیز کے دین بننے کا معیار۔ اگر غامدی صاحب کا یہ نکتہ نظر مان لیا جائے کہ تواتر عملی سے ایک چیز دین بن جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ صحابہ کے لیے دین اور تھا اور ہمارے لیے دین اور ہے۔ کیونکہ غامدی صاحب کے بقول ہمارے لیے تو اللہ کے رسول ﷺ کے وہ اعمال دین قرار پائیں گے جو کہ تواتر عملی سے نقل ہوئے ہوں جبکہ صحابہ کے لیے اللہ کے رسول ﷺ کا ہر عمل دین ہو گا کیونکہ وہ تو اللہ کے رسول ﷺ کے ہر عمل کا براہ راست مشاہدہ کر رہے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ایک عمل جو کہ خبر واحد سے ثابت ہے غامدی صاحب کے نزدیک وہ ہمارے لیے دین نہیں ہے کیونکہ وہ تواتر عملی سے ثابت نہیں ہے، تو کیا وہ عمل صحابہ کے لیے بھی دین نہیں ہو گا جو کہ دیکھتی آنکھوں اس کا مشاہدہ کر رہے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ تواتر عملی کسی چیز کو دین ٹھہرانے کا کوئی معیار نہیں ہے۔ دین وہ ہے جسے اللہ اور اس کا رسول ﷺ دین قرار دیں، چاہے وہ خبر واحد سے ہمیں ملے یا قولی تواتر سے یا عملی تواتر سے۔ 'ذریعے' سے کوئی چیز دین نہیں بنتی، بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے دین بنانے سے ایک چیز دین بنتی ہے اور بعد میں کسی ذریعے سے ہم تک پہنچتی ہے۔ یعنی دین پہلے موجود ہے پھر ذریعہ ہے جس سے وہ ہم تک پہنچا ہے۔ جبکہ غامدی صاحب کے بقول ذریعہ پہلے ہے اور دین بعد میں ہے۔ ذریعے نے ہی ایک چیز کو دین بنانا ہے اور ایک چیز کو دین سے خارج کرنا ہے۔

## تواتر عملی اور بدعات:

جس زمانے میں بیٹھ کر غامدی صاحب تواتر عملی کی بات کر رہے ہیں اس سے بدعات تو ثابت ہو سکتی ہیں لیکن دین کسی طور ثابت نہیں ہو سکتا۔ خلافت راشدہ کے بعد سے امت مسلمہ کا سوادِ اعظم جس کو دین کے نام سے پیش کرتا رہا ہے یا کر رہا ہے اسے ہرگز دین کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ شرک و بدعات کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ نوع انسانی کی، اس لیے یہ سمجھنا کہ بدعات تو اٹھارویں یا انیسویں صدی کی ایجاد ہیں، محض خیال باطل ہے۔

## سنت کی روایت کا اصل ذریعہ خبر یا تواتر عملی:

غامدی صاحب کے نزدیک سنت کی روایت کا ذریعہ تواتر عملی ہے۔ہم غامدی صاحب سے یہ سوال کرتے ہیں کہ جس زمانے میں آپ موجود ہیں اس کے تواتر عملی کو تو آپ ثابت کر دیں گے،لیکن اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کو جاری ہوئے چودہ صدیاں گزر چکی ہیں، ہر صدی میں اللہ کے رسول ﷺ کی ہر ایک سنت کے حوالے سے تواتر عملی کو آپ کیسے ثابت کریں گے۔کسی مسئلے کے بارے میں یہ جاننے کے لیے کہ یہ امت میں تواتر سے چلا آ رہا ہے،اس کا واحد ذریعہ خبر ہے۔معاملہ یہ ہے جس خبر واحد سے جان چھڑانے کے لیے غامدی صاحب نے تواتر عملی کا فلسفہ گھڑا تھا،خود تواتر عملی کا ثبوت اس خبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔کیونکہ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ غامدی صاحب کے بقول جس طرح سنن تواتر عملی سے نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں اسی طرح بدعات بھی تواتر عملی سے ہی نقل ہوتی رہی ہیں۔اب ایک عمل کے بارے میں یہ فیصلہ کیسے کیا جائے گا کہ وہ سنت ہے یا بدعت؟اس کا جواب دیتے ہوئے غامدی صاحب فرماتے ہیں:

> تواتر ایک ٹھوس حقیقت ہے،یہی کسی عمل کے محکم اساس پر قائم ہونے کی دلیل ہے۔بے شک بہت سی بدعات رائج ہو گئیں،بے عملی بڑھ گئی،لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس امت کی ساری تاریخ کا واضح ریکارڈ موجود ہے۔حضور کا زمانہ،صحابہ کا دور اور تابعین کے عہد سے لے کر آج تک کیا کچھ اصل ہے کیا کچھ اختراع کیا گیا یہ سب امت کے سامنے ہے۔(۸)

غامدی صاحب کے بقول جب کسی چیز کے بارے میں یہ اختلاف ہو جائے گا کہ یہ سنت ہے یا بدعت تو امت مسلمہ کی تاریخ اس بارے میں فیصلہ کرے گی کہ کیا یہ عمل واقعتاً اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے سے چلا آ رہا ہے یا بعد کے کسی زمانے کی ایجاد ہے۔غامدی صاحب کی حالت تو اس شخص کی سی ہے کہ جس کے بارے میں عربی زبان میں ایک کہاوت معروف ہے:

**فر من المطر و قر تحت الميزاب**

بارش سے بچنے کے لیے بھاگا اور پرنالے کے نیچے آ کے کھڑا ہو گیا۔

غامدی صاحب خبر واحد سے بھاگے تھے اور بالآخر تاریخ ان کے گلے پڑ گئی، جو ایسی اخبار پر مشتمل ہے جس کی نہ تو کوئی سند ہے، نہ اسماء و رجال اور نہ ہی اس کے پرکھنے کے لیے اصول الروایۃ موجود ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ امت مسلمہ کی چودہ صدیوں کی تاریخ میں کسی عمل کے بارے میں تواتر عملی کو ثابت کرنا بغیر خبر کے ممکن نہیں ہے۔جن ستائیس چیزوں کے بارے میں غامدی صاحب یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ ہمیں تواتر عملی سے ملی ہیں،ان مسائل کو وہ ذرا مذاہب اَربعہ کی کتابیں کھول کر دیکھیں تو ان پر واضح ہو جائے گا کہ اَئمہ میں ان مسائل میں کس قدر اختلاف موجود ہے۔مثال کے طور پر نماز کو ہی لے لیں،ارکان اسلام میں سب سے اہم رکن اور اس کی ہیئت تک میں اختلاف موجود ہے۔ہاتھ چھوڑے جائیں یا باندھے جائیں؟اگر باندھے جائیں تو کہاں باندھے جائیں؟رکوع میں جاتے وقت اور اس سے اٹھتے وقت رفع الیدین کیا جائے یا نہ کیا جائے؟جلسہ استراحت کیا جائے یا نہ کیا جائے؟تشہد میں تورک کیا جائے یا نہ کیا جائے؟وغیرہ، یہ اختلافات آج کے دور کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ یہ اختلافات اَئمہ اَربعہ سے چلے آ رہے ہیں اور مذاہب اَربعہ کی ہر دور کی کتب فقہ میں ان مسائل کے بارے میں تفصیلی اَبحاث موجود ہیں جن کو دیکھ کر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اَئمہ اَربعہ نے ان مسائل میں اختلاف تواتر عملی کی وجہ سے نہیں کیا بلکہ اپنے موقف کی تائید کے لیے خبر کو پیش کیا جس یہ ثابت ہوتا ہے کہ اَوائل اسلام میں بھی دین کے ثبوت کے لیے تواتر عملی کوئی دلیل نہ تھی بلکہ اصل دلیل خبر تھی۔جہاں تک مالکیہ کے اصول 'تعامل اہل مدینہ' کا معاملہ ہے کہ جسے امین احسن اصلاحی صاحب نے 'تدبر حدیث' میں تواتر عملی کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ اس اصول کی نسبت امام مالک سے ثابت ہی نہیں ہے اور دوسری بات یہ کہ مالکیہ کے اصول 'تعامل اہل مدینہ' اور فکر اصلاحی کے تصور 'تواتر عملی' میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔جس تعامل کو وہ حجت سمجھتے ہیں اس سے ان کی مراد مدینہ کے صحابہ کا تعامل ہے نہ کہ مابعد کی نسلوں کا۔

آج تو تواتر عملی سے یہ بات ثابت ہے کہ فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا نماز کا حصہ ہے، وتر کی نماز عشاء کی نماز کا حصہ ہے نہ کہ تہجد کی نماز کا، نماز تراویح اور ہے اور اور نماز تہجد اور ہے۔کیا غامدی صاحب ان سب اَعمال کو ایسے ہی مانتے ہیں جیسا کہ تواتر عملی سے ثابت ہے؟اگر نہیں، تو کس بنیاد پر؟خبر واحد کی بنیاد پر یا تاریخ کی بنیاد پر؟

فصل ہفتم:

# غامدی صاحب کا اپنے ہی بیان کردہ اصول سنت سے انحراف

جس طرح ہم یہ واضح کر چکے ہیں غامدی صاحب کا اصول سنت غلط ہے اسی طرح اس اصول کے اطلاق میں بھی غامدی صاحب سے بعض مسائل میں غلطی ہوئی ہے۔

## داڑھی کا مسئلہ:

غامدی صاحب داڑھی کو سنت میں شمار نہیں کرتے جیسا کہ ان کی بیان کردہ سنن کی فہرست سے واضح ہوتا ہے۔ حالانکہ داڑھی حضرت ابراہیم سے لے کر آپ تک تمام انبیاء کی سنت رہی دور جاہلیت میں اہل عرب داڑھی رکھتے تھے آپؐ نے بھی داڑھی رکھی، اس کا حکم بھی دیا اور تمام صحابہ کی داڑھی تھی۔ داڑھی کی سنت غامدی صاحب کی تعریف کے سوفی صد مطابق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ تمام انبیاء کی سنت رہی ہے یہ دین ابراہیم کی وہ روایت ہے کہ جس پر دور جاہلیت میں بھی اکثر اہل عرب قائم تھے اور آپؐ نے دین ابراہیمی کی اس روایت کو عملاً برقرار رکھا اور اس کا امت کو حکم بھی جاری فرمایا۔ بعد میں یہ سنت صحابہ کرام کے اجماع سے ثابت ہوئی اور امت کے تواتر سے ہم تک منتقل ہوئی۔ اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث ہے:

**خالفوا المشرکین وفروا اللحی و أحفوا الشوارب(۹)**

مشرکین کی مخالفت کرو داڑھیوں کو چھوڑ دو اور مونچھوں کو پست کرو

ابن حجر عسقلانی 'خالفوا المشرکین' کی شرح میں لکھتے ہیں:

**فی حدیث أبی ھریرۃ عند مسلم خالفوا المجوس و ھو المراد فی حدیث ابن عمر فانھم کانوا یقصون لحاھم ومنھم من کان یحلقھا**

حضرت ابو ہریرہ کی حدیث جو مسلم میں ہے اس میں 'خالفوا المشرکین' کی جگہ 'خالفوا المجوس' کے الفاظ ہیں اور اس حدیث میں بھی یہی مراد ہے کیونکہ مجوسیوں کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنی داڑھیاں کاٹتے تھے اور ان میں سے بعض اپنی داڑھیاں مونڈتے تھے۔

ابن حجر کی اس تشریح اور تاریخ وسیر کی کتب سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مشرکین مکہ بھی اپنی داڑھیوں کو چھوڑتے تھے۔

مسلم کی روایت میں الفاظ ہیں:

**جزوا الشوارب و أرخوا اللحی خالفوا المجوس(۱۰)**

مونچھوں کو پست کرو اور داڑھی کو چھوڑ دو مجوسیوں کی مخالفت کرو۔

اللہ کے رسول ﷺ کے ان فرامین سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے دین ابراہیمی کی اس روایت کو بطور دین اس امت میں جاری کیا اور داڑھی منڈانے کو مجوسیوں کی تہذیب قرار دیا۔

## دوپٹے کا انکار:

صحابہ کرام اور امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت کے سر کے بال اس کے ستر میں داخل ہیں۔ اور تواتر عملی سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ عورتیں ہمیشہ سے ایک بڑی چادر لے کر گھر سے باہر نکلتی ہیں جس سے اپنے سارے جسم کو ڈھانپ لیتی ہیں۔ لیکن غامدی صاحب عورت کے ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے ساتھ ساتھ سر کے بالوں کو بھی ستر شمار نہیں کرتے۔ دوپٹے سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

اصل میں ضرورت اس بات کی ہے کہ خواتین کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ ان کی تہذیب وثقافت کیا ہے اور انہیں کن حدود کا پابند رہ کر زندگی بسر کرنی چاہیے۔ دوپٹا ہمارے ہاں مسلمانوں کی تہذیبی روایت ہے، اس بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ دوپٹے کو اس لحاظ سے پیش کرنا کہ یہ شرعی حکم ہے، اس کا

کوئی جواز نہیں۔البتہ اسے ایک تہذیبی شعار کے طور پر ضرور پیش کرنا چاہیے۔اصل چیز سینہ ڈھانپنا اور زیب و زینت کی نمائش نہ کرنا ہے۔یہ مقصد کسی اور ذریعے سے حاصل ہو جائے تو کافی ہے۔اس کے لیے دوپٹا ہی ضروری نہیں ہے۔(۱۱)

غامدی صاحب کس سادگی سے کہہ رہے ہیں کہ دوپٹے کے لیے اللہ تعالی نے کوئی حکم جاری نہیں کیا سبحان اللہ عما یصفون۔حالانکہ دوپٹہ تو سنت کی اس تعریف سے بھی ثابت ہوتا ہے جو کہ غامدی صاحب نے اختراع کی ہے۔عورت کے ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے بارے میں تو علماء کا جزوی اختلاف ہے کہ یہ عورت کے ستر میں داخل ہیں یا نہیں، لیکن عورت کے سر کے بالوں کے بارے میں امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ یہ عورت کا ستر ہیں اور عورت کے لیے ان کو چھپانا لازم ہے۔علاوہ ازیں امت مسلمہ میں تواتر عملی سے یہ بات ثابت ہے کہ مسلمان عورتیں، صحابیات کے زمانے سے لے آج تک، جب بھی کسی کام سے گھر سے باہر نکلتی ہیں تو ایک بڑی چادر لے کر باہر نکلتی ہیں جس سے اپنے سارے جسم کو ڈھانپ لیتی ہیں۔اس تواتر عملی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام غزالی لکھتے ہیں:

**لسنا نقول أن وجه ا لرجل فی حقها عورة کوجه المرأةبل هو کوجه الأمرد فی حق الرجل فیحرم النظر عند خوف الفتنة فقط و ان لم تکن فتنه فلا،اذ لم تزل الرجال علی ممر الزمان مکشوفی الوجوه و النساء یخرجن منتقبات فلوا استووا لأمر الرجال با لتنقب أو منعن من الخروج (۱۲)**

ہم یہ نہیں کہتے کہ مرد کا چہرہ عورت کے لیے ستر ہے جیسا کہ عورت کا چہرہ مرد کے لیے ستر ہے، بلکہ مرد کا چہرہ (عورت کے لیے) ایسا ہی ہے جیسا کہ بے ریش بچے کا چہرہ مرد کے لیے ہے۔یعنی اگر فتنے کا اندیشہ ہوگا تو اس (مرد) کی طرف دیکھنا حرام ہوگا اور اگر فتنہ نہ ہر تو پھر اس (مرد) کی طرف دیکھنا جائز ہے۔کیونکہ ہمیشہ سے یہ بات چلی آ رہی ہے کہ مرد ہر زمانے میں کھلے چہرے کا ساتھ باہر نکلتے ہیں، جبکہ عورتیں نقاب پہن کر باہر نکلتی ہیں، اگر مرد بھی اس مسئلے میں عورتوں کے برابر ہوتے تو ان کو نقاب پہننے کا حکم دیا جاتا یا عورتوں کو باہر نکلنے سے منع کر دیا جاتا۔

اسی تواتر عملی کو علامہ ابوحیان اندلسی نے 'البحر المحیط' میں، ابن حجر عسقلانی نے 'فتح الباری' میں اور امام شوکانی نے 'نیل الأوطار' میں نقل کیا ہے۔غامدی صاحب کے پاس تواتر عملی کے صرف دعوے ہیں۔اپنی بیان کردہ کسی سنت کے بارے میں پچھلی چودہ صدیوں میں تواتر عملی کو ثابت کرنے کے لیے ان کے پاس سوائے خبر اور روایت کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اپنی ان سنن کے حوالے سے تواتر عملی کے ثبوت کے لیے وہ خبر پیش کرنے سے بھی عاجز ہیں۔یہاں امام غزالی، عورت کے بال تو چھوڑیے، نقاب یعنی چہرے کے پردے کے بارے میں، اپنے زمانے کے مشاہدے کے ساتھ ساتھ، یہ بات کہہ رہے ہیں کہ وہ تواتر عملی سے ثابت ہے۔پس ثابت ہوا کہ عورت کے بال بھی ستر میں داخل ہیں۔اس پر امت مسلمہ کا اجماع ہے اور صحابیات کے زمانے سے لے کر آج کل کے بگڑے ہوئے اور بے عمل مسلمان معاشروں میں بھی یہ دوپٹہ تواتر عملی سے ثابت ہے۔تہذیب کا مسئلہ آج کل کا مسئلہ تو ہوسکتا ہے لیکن آج سے چودہ صدیاں پہلے مروجہ معنوں میں تہذیب کا کوئی نام بھی نہیں جانتا تھا۔اس وقت میں صحابیات کا اپنے سر اور چہرے کو ڈھانپ کر رکھنا تہذیبی روایت نہیں تھی۔بلکہ وہ اس پر عمل، اسے اللہ کا دین سمجھ کر کرتی تھیں نہ کہ تہذیبی روایت سمجھ کر!

## خلاصہ کلام:

غامدی صاحب کا تصور کتاب ہو یا تصور سنت، اس کے پیچھے ایک ہی بنیادی محرک نظر آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی طرح دین اسلام کی ایسی جامع تعبیر پیش کی جائے جو تمام مذاہب سماویہ کو ایک بنا دے۔اسی تصور کے تحت انھوں نے لفظ 'کتاب' کے مفہوم میں تورات، انجیل اور زبور کو بھی شامل کر دیا۔اور اسی تصور کے تحت انھوں نے 'سنت' کی نسبت حضرت ابراہیم کی طرف کی، کیونکہ حضرت ابراہیم ہی وہ واحد شخصیت ہیں کہ جن کی طرف یہودی، عیسائی اور مسلمان اپنی نسبت کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔غامدی صاحب نے کتاب وسنت کی اصطلاحات کا اہل سنت کے ہاں معروف معنی لینے کی بجائے اپنا نیا معنی متعارف کروایا تاکہ وہ مذاہب سماویہ کو ایک جامع تصور اور فکر کے تحت جمع کر سکیں۔لیکن ہمیں افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ غامدی صاحب نے مذاہب سماویہ کو اکٹھا کرنے کے چکر میں امت مسلمہ کو تفرقے میں ڈال دیا۔وہ امت جو آپ ؐ سے لے کر آج تک اس تصور پر متفق تھی کہ کتاب سے مراد قرآن ہے جو آپ ؐ پر نازل ہوا اور سنت سے مراد آپ ؐ کی سنت ہے جو بذریعہ وحی خفی آپ کو ملی، غامدی صاحب نے وحدت مذاہب سماویہ کے مقصد کے تحت، کتاب وسنت کی ایسی تعریف بیان کی جو امت مسلمہ کے اس اجماعی تصور کے مخالف ہے، جو کہ آپ ؐ کے زمانے سے

لے کر آج تک ان کے ہاں معروف ہے۔ غامدی صاحب اپنی فکر کو عالمی فکر بنانے کے لیے کوشاں ہیں، جبکہ صورت حال یہ ہے کہ شاید یہودی اور عیسائی تو ان کے تصورات کتاب وسنت کو تسلیم کر لیں لیکن پورا عالم اسلام تو کیا، خوف خدا رکھنے والا کوئی ایک عالم بھی ان کے اس تصور کتاب وسنت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا، جو کہ چودہ صدیوں سے امت میں رائج تصور کے خلاف ہے۔ غامدی صاحب کا خلوص اپنی جگہ، لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہود ونصاری بھی غامدی صاحب کے تصور کتاب وسنت کو اسی وقت قبول کرنے کے لیے تیار ہوں گے، جب کہ غامدی صاحب اپنے اصولوں کی طرح فروعات میں بھی ایسے تصورات پیش کریں جو کہ ان کے لیے قابل قبول ہوں اور غامدی صاحب خود نہ سہی لیکن ان سے مستفید ہونے والے سکالرز حضرات بخوبی یہ فریضہ بھی سرانجام دے رہے ہیں اور نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ غامدی صاحب کی سر پرستی میں شائع ہونے والے ایک انگلش رسالہ Rennaissance میں ہم جنس پرستی کو فطرت انسانی قرار دیا جا رہا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

**و لن ترضى عنك اليهود و لا النصارى حتى تتبع ملتهم** (البقرة:١٢٠)

اے نبی ﷺ یہود ونصاری آپ سے اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک آپ ان کے دین کی پیروی نہ کریں

لہذا غامدی صاحب کو چاہیے کہ مذاہب ساویہ کو جمع کرتے کرتے امت مسلمہ میں انتشار پیدا نہ کریں۔ اگر وہ مذاہب ساویہ کو اکٹھا کرنا ہی چاہتے ہیں تو اس بنیاد پر اکٹھا کریں جو کہ خود قرآن نے پیش کی ہے ارشاد باری تعالی ہے:

**قل يا اهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا و بينكم ألا نعبد الا الله و لا نشرك به شيئا و لا يتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون** (آل عمران:٦٤)

اے نبی ﷺ کہہ دیں اے اہل کتاب: آؤ! ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں بعض، بعض کو رب نہ بنا لے اللہ کو چھوڑ کر، پس اگر تم پھر جاؤ گے (یعنی یہ ہمارے تمہارے درمیان جو اتحاد کی بنیاد ہے اگر تم اس بنیاد پر ہم سے اتحاد کرنے کے لیے تیار نہیں ہو گے) تو گواہ رہو کہ ہم تو مسلمان ہیں۔

## باب دوم کے حوالہ جات:


۱)۔ میزان، جاوید احمد غامدی، ص۱۰

۲)۔ میزان، جاوید احمد غامدی، ص۶۵

۳)۔ ماہنامہ اشراق: جون ۲۰۰۲، ص۲۹

۴)۔ سنن ابن ماجۃ، کتاب الأضاحی، باب ثواب الأضحیۃ

۵)۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجامع، ماجاء السنۃ فی الفطرۃ

۶)۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب قص الشارب

۷)۔ میزان، جاوید احمد غامدی، ص۶۶

۸)۔ ماہنامہ اشراق: نومبر ۱۹۹۹، ص۵۳

۹)۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب تقلیم الأظفار

۱۰)۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب خصال الفطرۃ

۱۱)۔ ماہنامہ اشراق: مئی ۲۰۰۲، ص۴۷

۱۲)۔ احیاء العلوم، کتاب النکاح، باب آداب المعاشرۃ

# باب سوم

# علامہ جاوید احمد غامدی کا تصورِ 'کتاب'

## فصل اول:

### غامدی صاحب کا تصور کتاب

جیسا کہ سابقہ ابواب میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ غامدی صاحب کے وضع کردہ اصول اہل سنت کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بہت سے مسائل میں غامدی صاحب نے خود اپنے وضع کردہ اصولوں سے بھی کلی طور پر انحراف کیا ہے۔ اس کی بعض مثالیں ذیل کی بحثوں میں سامنے آئیں گی۔

غامدی صاحب کے نزدیک قرآن میں لفظ کتاب سے مراد کلام الٰہی ہے چاہے یہ تورات وانجیل کی شکل میں ہو یا قرآن وزبور کی صورت میں، ان کے مآخذ دین میں منسوخ شدہ آسمانی کتابیں تورات وانجیل وغیرھم بھی شامل ہیں۔ غامدی صاحب نے کتاب کا یہ مفہوم اپنے استاذ امام امین احسن اصلاحی صاحب سے لیا ہے۔ لفظ کتاب کے اس نادر مفہوم کو غامدی صاحب کی تفسیر 'البیان' اور ان کے استاذ امام کی تفسیر 'تدبر القرآن' میں 'ذلك الكتاب لا ريب فيه' کی تشریح میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ غامدی صاحب نے اپنی کتاب صول مبادی میں کسی جگہ کتاب کی تعریف بیان نہیں کی۔ انہوں نے اصول ومبادی کے آغاز میں قرآن کی تعریف بیان کی ہے۔ غامدی صاحب کے نزدیک قرآن کتاب الٰہی کا ایک حصہ ہے کل کتاب نہیں ہے کتاب کے مفہوم میں ان کے نزدیک تورات، انجیل اور زبور غیرہ بھی شامل ہیں۔

یہ غامدی صاحب کے تصور کتاب کا ہی نتیجہ ہے کہ خود ان کی طرف سے یا ان کے مریدین کی طرف سے جب بھی کوئی نئی تحقیق سامنے آتی ہے اس میں اکثر وبیشتر کتب سابقہ سے استدلال کیا جاتا ہے۔ غامدی صاحب کے نزدیک سابقہ کتب سماویہ پر عمل کرنے کی علت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی نبوت میں اللہ کی بندوں کے لئے بھیجی گئی شریعت کے احکامات بہت حد تک ایک واضح سنت کی شکل اختیار کر گئے تھے اور حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت محمد تک جتنی بھی شریعتیں آئیں ان میں نسخ بہت کم ہے اس لئے امت محمدیہ اللہ کے رسول ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے ساتھ ساتھ ان تمام شرائع سابقہ کی مخاطب ومتعبد ہے بشرطیکہ کتاب مقدس کی تعلیمات محفوظ ثابت ہو جائیں۔ ان کے نزدیک سابقہ شرائع کے اکثر وبیشتر احکامات اب بھی دین اسلام میں قانون سازی کا ایک بہت بڑا ماخذ ہیں اگرچہ سابقہ شرائع کے بعض احکامات میں نسخ کے وہ قائل ہیں غامدی صاحب نے اپنے اس مؤقف کو اپنی کتاب 'میزان' میں 'دین کی آخری کتاب' کے عنوان سے ص ۴۷ سے لے کر ص ۵۲ تک مفصل بیان کیا ہے غامدی صاحب کی اس طویل عبارت کا خلاصہ ان کے شاگرد خاص جناب منظور الحسن صاحب درج ذیل الفاظ میں نکال رہے ہیں وہ لکھتے ہیں:

> ''قرآن مجید دین کی آخری کتاب ہے۔ دین کی ابتدا اس کتاب سے نہیں، بلکہ ان بنیادی حقائق سے ہوتی ہے جو اللہ نے روز اول سے انسان کی فطرت میں ودیعت کر رکھے ہیں۔ اس کے بعد وہ شرعی احکام ہیں جو وقتاً فوقتاً انبیاء کی سنت کی حیثیت سے جاری ہوئے اور بالآخر سنت ابراہیمی کے عنوان سے بالکل متعین ہو گئے۔ پھر تورات، زبور اور انجیل کی صورت میں آسمانی کتابیں ہیں جن میں ضرورت کے لحاظ سے شریعت اور حکمت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نبی ﷺ کی بعثت ہوئی اور قرآن مجید نازل ہوا۔ چنانچہ قرآن دین کی پہلی نہیں بلکہ آخری کتاب ہے اور دین کے مصادر قرآن کے علاوہ فطرت کے حقائق، سنت ابراہیمی کی روایت اور قدیم صحائف بھی ہیں'۔ اس موضوع پر مفصل بحث استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی تالیف ''میزان'' کے صفحہ ۴۷ پر ''دین کی آخری کتاب'' کے زیر عنوان ملاحظہ کی جاسکتی ہے''۔ (۱)

اسی لئے سابقہ کتب سماویہ کی تعلیمات جب ان کے خود معین کردہ معیار صدق وکذب پر پوری اترتی ہوں تو وہ ان کتابوں کی آیات سے قرآنی آیات کی طرح کثرت سے استدلال کرتے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اصل میں غامدی صاحب نے علت نکالنے میں غلطی کھائی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت کے بعد اور قرآن کے نزول کے بعد امت محمدیہ سابقہ شرائع کی متعبد نہیں ہے اللہ کے رسول ﷺ کا لایا ہوا دین اور شریعت جامع اور کامل واکمل ہے۔ بالفرض اگر پچھلی شریعتیں محفوظ بھی ثابت ہو جائیں پھر بھی ان پر عمل نہیں ہوگا الا یہ کہ کوئی حکم پچھلی شریعتوں میں موجود ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری شریعت میں بھی ثابت رکھا گیا ہو یا اس کی تصدیق مذکور ہو، یعنی اس پر عمل اس وجہ سے

کیا جائے گا کہ وہ ہماری شریعت میں ثابت یا مذکور ہے نہ کہ اس پر عمل پچھلی شریعت کی بنا پر ہوگا۔ اس کی تفصیلات ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ غامدی صاحب کے نزدیک حضرت ابراہیم کے بعد آنے والی تمام شریعتیں تقریباً کامل تھیں اور ہر دور کی تہذیب وتمدن کے لئے رہنمائی کی صلاحیت رکھتی تھیں، جبکہ ہم صرف اس پہلو سے تمام سابقہ شرائع کو کامل مانتے ہیں کہ وہ خاص ادوار کے لئے کامل ہدایت تھیں جبکہ زمان ومکان کی تخصیص کے بغیر رہتی دنیا تک آپ کی شریعت کے علاوہ باقی تمام شریعتیں ناقص ہیں۔ پچھلی آسمانی کتابیں اپنے مخصوص دور تک کے لئے تھیں اور قرآن کے آنے کے بعد ان کی تشریعی نکتہ نظر سے ضرورت بھی باقی نہیں رہی۔

## سابقہ شرائع سے استدلال کرنے کے غامدی صاحب کے اصول:

سابقہ شرائع سے استدلال کے لئے غامدی صاحب کا اصل اصول ان کے شاگرد خاص جناب طالب محسن صاحب ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

'بائبل تورات، زبور، انجیل اور دیگر صحف سماوی کا مجموعہ ہے۔ اپنی اصل کے لحاظ سے یہ اللہ ہی کی شریعت اور حکمت کا بیان ہے۔ اس کے مختلف حاملین نے اپنے اپنے مذہبی تعصّبات کی بنا پر اگرچہ اس کے بعض اجزاء کو ضائع کر دیا اور بعض میں تحریف کر دی، تاہم اس کے باوجود اس کے اندر پروردگار کی رشد و ہدایت کے بے بہا خزانے موجود ہیں۔ اس کے مندرجات کو اگر اللہ کی آخری اور محفوظ کتاب قرآن مجید کی روشنی میں سمجھا جائے تو فلاح انسانی کے لئے اس سے بہت کچھ اخذ واستفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب مقدس میں موسیقی اور آلات موسیقی کا ذکر متعدد مقامات پر موجود ہے۔ ان سے بصراحت یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبروں کے دین میں موسیقی یا آلات موسیقی کو کبھی ممنوع قرار نہیں دیا گیا' (۲)

اس اصول کو ہم قارئین کی آسانی کی خاطر مزید تین حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں کیونکہ غامدی صاحب کے کتاب مقدس سے استدلال کو اگر ہم سامنے رکھیں تو ان کا مذکورہ بالا یہ اصول تین طرح سے ہمارے سامنے آتا ہے:

۱) اگر کسی مسئلے کے بارے میں قرآن میں اشارات موجود ہوں یعنی لفظوں میں رہنمائی موجود نہ ہو تو قرآن میں وارد شدہ ان اشارات کو بنیاد بنا کر اسی مسئلے کے بارے میں کتب سماویہ کی تفصیلات کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ اس اصول کے تحت غامدی صاحب نے مسئلہ موسیقی کو ثابت کیا ہے۔

غامدی صاحب کے بقول کتاب مقدس سے موسیقی اور آلات موسیقی کا جواز معلوم ہوتا ہے ایک جگہ زبور کا حوالہ دیتے ہوئے موسیقی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'اے خداوند میں تیرے لئے نیا گیت گاؤں گا۔ دس تار والی بربط پر میں تیری مدح سرائی کروں گا'۔ (۳)

ایک دوسری جگہ کتاب مقدس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'تو ایسا ہوا کہ جب نرسنگے پھونکنے والے اور گانے والے مل گئے تا کہ خداوند کی حمد اور شکر گزاری میں ان سب کی آواز سنائی دے اور جب نرسنگوں اور جھانجھوں اور موسیقی کے سب سازوں کے ساتھ انھوں نے اپنی آواز بلند کر کے خداوند کی ستایش کی کہ وہ بھلا ہے'۔ (۴)

جب ہم غامدی صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ کتاب مقدس کی یہ آیات محفوظ ہیں یا منسوخ نہیں ہیں تو غامدی صاحب یہ جواب دیتے ہیں کہ قرآن میں موسیقی کے جواز کے بارے میں اشارات موجود ہیں اور قرآن میں موجود یہ اشارات کتاب مقدس کی آیات کی تصدیق کر رہے ہیں کہ یہ آیات نہ تو منسوخ ہیں اور نہ ہی غیر محفوظ، بلکہ ہمارے لئے شریعت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

'جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں قرآن مجید اصلاً خاموش ہے۔ اس کے اندر کوئی ایسی آیت موجود نہیں ہے جو موسیقی کی حلت وحرمت کے حوالے سے کسی حکم کو بیان کر رہی ہو۔ البتہ، اس میں بعض ایسے اشارات موجود ہیں جن سے موسیقی کے جواز کی تائید ہوتی ہے۔ ان کی بنا پر قرآن سے موسیقی کے جواز کا یقینی حکم اخذ کرنا تو بلا شبہ کلام کے اصل مدعا سے تجاوز ہوگا'۔ (۵)

گویا کہ غامدی صاحب کے نزدیک قرآن میں، ان کے بقول، موسیقی کے وارد شدہ اشارات اس بات کی دلیل ہیں کہ موسیقی کے حوالے سے کتاب مقدس کی آیات محفوظ ہیں۔

۲) اگر کسی مسئلہ کے بارے میں قرآن میں خبر کے انداز میں لفظوں میں سابقہ شرائع کے حوالے سے کوئی رہنمائی موجود ہو اور یہ الفاظ مجمل ہوں تو ان الفاظ قرآنیہ کی

تفصیل کتاب مقدس کی آیات سے کی جاسکتی ہے۔اس اصول کے تحت غامدی صاحب نے قرآن میں موجود لفظ 'تماثیل' کی بائبل کی آیات کی روشنی میں تفصیل کی ہے۔اور شیر،بیل اور ملائکہ کی تصاویر کو بھی کتاب مقدس کی روشنی میں صحیح قرار دیا ہے۔ایک جگہ تورات کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت سلیمان کے محل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'اوران حاشیوں پر جو پڑوں کے درمیان تھے،شیر اور بیل اور کروبی (فرشتے) بنے ہوئے تھے'۔ (٦)

ایک اور جگہ ہیکل کی تعمیر کے حوالے سے تورات کی آیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'اورالہام گاہ میں اس نے زیتون کی لکڑی کے دو کروبی (فرشتے) دس دس ہاتھ اونچے بنائے'۔ (٧)

جب ہم غامدی صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ توارت کی ان آیات کے محفوظ ہونے کی کیا دلیل ہے تو وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ قرآن میں حضرت سلیمان کے حوالے سے تماثیل کا ذکر موجود ہے گویا کہ قرآن کے اجمالی الفاظ تورات کی ان تفصیلات کی تائید کررہے ہیں۔

٣) قرآن کے مبہمات کی وضاحت کے لئے بھی غامدی صاحب کتاب مقدس سے رہنمائی لیتے ہیں۔اس اصول کے تحت انہوں نے قرآن میں موجود یاجوج و ماجوج سے متعلقہ مبہم الفاظ کی توضیح اقوام مغرب سے کی ہے۔یاجوج ماجوج سے متعلقہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

'اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یاجوج ماجوج کی اولاد، یہ مغربی اقوام، عظیم فریب پر مبنی فکر وفلسفہ کی علم بردار ہیں اور اسی سبب سے، نبی ﷺ نے انھیں دجال (عظیم فریب کار) قرار دیا ہے'۔ (٨)

گویا کہ غامدی صاحب کے نزدیک قرآن میں جو یاجوج ماجوج کا جو ذکر ہے،اس سے مراد مغربی اقوام ہیں۔لیکن جب ہم غامدی صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ قرآن میں اللہ سبحانہ وتعالی نے جو یاجوج ماجوج کا ذکر کیا ہے اس سے مراد مغربی اقوام ہیں،تو جواب میں غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ تورات سے اس بات کی تعیین ہوتی ہے کہ یاجوج ماجوج سے مراد مغربی اقوام ہیں۔یاجوج ماجوج کا تعین کرتے ہوئے ایک جگہ تورات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

'اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد جوج کی طرف ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش (روس) مسک (ماسکو) اور توبل (توبالسک) کا فرماں روا ہے،متوجہ ہو اور اس کے خلاف نبوت کر'۔ (٩)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

'اپنے اس علاقے سے قدیم زمانوں میں یہی لوگ یورپ میں جا کر آباد ہوئے اور وہاں سے پھر صدیوں کے بعد تاریخ کی روشنی میں امریکہ اور آسٹریلیا پہنچے،اوراب دنیا کے سارے پھاٹک انھی کے قبضے میں ہیں'۔ (١٠)

جب ہم غامدی صاحب سے یہ سوال کرتے ہیں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ تورات کی یہ آیات محفوظ ہیں تو وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ قرآن میں موجود یاجوج ماجوج کا ذکر تورات کی ان آیات کی تصدیق کررہا ہے۔

فصل دوم:

# غامدی صاحب کے تصور کتاب کی غلطی

قدیم صحائف سے استدلال کا جو اصول غامدی صاحب نے وضع کیا ہے یہ بوجوہ غلط ہے تفصیلات ذیل میں مذکور ہیں۔

۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ غامدی صاحب کے بقول اشارات قرآنی سے کتاب مقدس کی آیات کی تصدیق ہوتی ہے۔ٹھیک ہے اگر ہم کچھ دیر کے لئے غامدی صاحب کی بات مان بھی لیں تو پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ اس بات کا تعین کون کرے گا کہ فلاں مسئلے کے بارے میں قرآن میں اشارات موجود ہیں کیونکہ اشارات ایک ایسی غیر واضح اصطلاح ہے کہ جو چاہے جب چاہے قرآن سے کوئی بھی مسئلہ 'اشارات' کی شکل میں نکال سکتا ہے۔مثال کے طور پر صوفیاء کی تفسیر اشاری دیکھی جاسکتی ہیں جس میں انھوں نے 'اشارات' کے نام پر قرآن سے عجیب وغریب قسم کے مسائل نکالے ہیں۔غامدی صاحب کے نزدیک قرآن میں موسیقی کے جواز کے بارے میں اشارات موجود ہیں جبکہ ہمارے نزدیک غامدی صاحب کا یہ کہنا غلط ہے۔قرآن میں مروجہ موسیقی کے جواز کے بارے میں کسی قسم کے اشارات موجود نہیں ہیں جس قسم کے اشارات سے غامدی صاحب نے مسئلہ موسیقی میں استدلال کیا ہے اس قسم کے اشارات سے تو ہر مسئلہ قرآن سے نکالا جاسکتا ہے۔غامدی صاحب کے بقول قرآن مجید کی آیات کا صوتی آہنگ اور قرآن کی آیت مبارکہ 'و سخرنا مع داود الجبال یسبحن و الطیر' میں یہ اشارات موجود ہیں کہ موسیقی جائز ہے۔غامدی صاحب کے اس نادر طرز استدلال پر ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ عقل عام بھی اس بات کا فیصلہ کرسکتی ہے کہ غامدی صاحب کا یہ طرز استدلال کس قدر بودا ہے۔کہاں قرآن کا صوتی آہنگ اور کہاں بینڈ باجے، ڈھول بانسریاں، گٹار اور پیانو وغیرہ جیسے آلات موسیقی، کہاں حضرت داؤد کا خوبصورت آواز میں اللہ کی تسبیح بیان کرنا، جس کا ذکر مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں ہو رہا ہے اور کہاں کسی عورت کا رقص وسرور کی محفلوں میں محبوب سے متعلق جذبات کا اظہار کرنا، اگر قرآن کا صوتی آہنگ اور حضرت داؤد کا خوبصورت آواز میں اللہ کی تسبیح بیان کرنا موسیقی ہے تو ہم بھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ قرآن میں موسیقی موجود ہے لیکن قرآن سے جو موسیقی غامدی صاحب ثابت کرنے چلے ہیں یا قرآن کے ان اشارات کی تطبیق میں غامدی صاحب ہمارے معاشروں میں موجود رقص وسرور کی جن محفلوں کی تائید کرنا چاہتے ہیں ان کی تائید کسی طرح سے بھی ان اشارات قرآنی سے ثابت نہیں ہو رہی۔ان اشارات قرآنی سے یہ بھی ثابت نہیں ہو رہا کہ حضرت داؤد کے پاس 'دس تاروں والی بربط' تھی جس پر وہ اللہ کی حمد وثنا کیا کرتے تھے، قرآن نے تو صرف حمد وثنا کا تذکرہ کیا ہے، دس تاروں والی بربط کا بیان صرف کتاب مقدس کا ہے جس کے بارے میں ہمارے علم میں نہیں ہے کہ یہ بیان محفوظ ہے یا نہیں۔

۲) دوسری بات یہ کہ غامدی صاحب نے قرآن میں وارد شدہ لفظ 'تماثیل' کو بنیاد بنا کر کتاب مقدس کی آیات کی تصدیق کی ہے۔حالانکہ قرآن نے تو صرف اس بات کی تصدیق کی ہے کہ حضرت سلیمان کے زمانے میں اللہ کے حکم سے جنات ان کے لئے 'تماثیل' بنایا کرتے تھے اب یہ تماثیل کیا تھیں اس کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔قرآن نے تماثیل کی تصدیق کی ہے نہ کہ شیر، بیلوں اور فرشتوں کی تصاویر کی، قرآن کے الفاظ میں اجمال ہے اور قرآن کتاب مقدس کی اس حد تک تو تصدیق کر رہا ہے کہ حضرت سلیمان کے دور میں تماثیل تھیں لیکن قرآن قطعا ان تفصیلات کی تصدیق نہیں کر رہا جو کہ کتاب مقدس میں موجود ہیں اس لئے قرآن کے اجمالی بیان سے کتاب مقدس کے اجمال کی تو تصدیق ہوتی ہے لیکن قرآن کے مجمل الفاظ کتاب مقدس کی تفصیلی آیات کی تصدیق نہیں کر رہے، اس لئے قرآن سے یہ بالکل بھی واضح نہیں ہوتا کہ کتاب مقدس کا یہ تفصیلی بیان محفوظ ہے یا اس میں بھی کمی بیشی ہو چکی ہے۔یہ بات تو واضح ہے کہ قرآن کے اجمال سے کتاب مقدس کا اجمال اور قرآن کی تفصیل سے کتاب مقدس کی تفصیل محفوظ ثابت ہوتی ہے لیکن قرآن کے اجمال سے کتاب مقدس کے تفصیلی بیان کو محفوظ ثابت کرنا عقل ونقل کے خلاف ہے۔قرآن میں وارد شدہ لفظ 'تماثیل' کسی طرح بھی کتاب مقدس کے لفظ 'کروبی' کی تصدیق نہیں کر رہا کہ حضرت سلیمان کے زمانے میں جنات فرشتوں کی بھی تصاویر بناتے تھے۔

۳) تیسری بات یہ کہ قرآن میں یاجوج ماجوج کا ذکر ہے لیکن قرآن نے اس بات کو واضح نہیں کیا کہ یاجوج ماجوج سے کیا مراد ہے یا یہ کون لوگ ہوں گے لیکن کتاب مقدس نے یاجوج ماجوج کا تذکرہ بھی کیا ہے اور ان کا تعین بھی کیا ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قرآن سے تو صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ کتاب مقدس میں جو یاجوج ماجوج کا تذکرہ ہے وہ صحیح ہے لیکن قرآن ہرگز بھی کتاب مقدس کی ان آیات کی تصدیق نہیں کر رہا جو کہ یاجوج ماجوج کی تعین کر رہی ہیں اس لئے ہمارے لئے یہ

بات ثابت نہیں ہوتی کہ کتاب مقدس کی یہ آیات محفوظ ہیں یانہیں یا یہ آیات کلام الٰہی ہیں یانہیں، بہر حال قرآن کسی طور بھی کتاب مقدس کی ان آیات کی تصدیق نہیں کر رہا جو کہ یاجوج ماجوج کی تعیین کے بارے ہیں۔

۴) چوتھی بات یہ کہ غامدی صاحب کتاب مقدس سے استدلال کا اپنا شوق ضرور پورا کریں لیکن ہم ان سے اتنی گزارش کرتے ہیں کہ پہلے کتاب مقدس کی ان آیات کو محفوظ تو ثابت کریں جن سے آپ استدلال کر رہے ہیں۔ چند موہوم اشارات قرآنیہ کو بنیاد بنا کر کتاب مقدس کی آیات کو محفوظ ثابت کرنا اور ان سے کسی شرعی مسئلے میں استدلال کرنا، کسی محقق کے شایان شان نہیں ہے۔ غامدی صاحب کے بقول:

'پیغمبروں کے دین میں موسیقی یا آلات موسیقی کو کبھی ممنوع نہیں قرار دیا گیا۔ بیش تر مقامات پر اللہ کی حمد وثنا کے لئے موسیقی کے استعمال کا ذکر آیا ہے۔'(۱۱)

لیکن ہم غامدی صاحب سے پوچھتے ہیں اس بات کی دلیل کیا ہے۔ اور وہ جواب میں دلیل کے طور پر کتاب مقدس کی آیات پیش کر دیتے ہیں۔ جب ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ کیا کتاب مقدس کی یہ آیات محفوظ ہیں تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ قرآن سے کتاب مقدس کی ان آیات کی تائید ہو رہی ہے۔ حالانکہ ان کا یہ دعوی صریحاً باطل ہے۔ قرآن کسی طرح بھی کتاب مقدس میں موجود نرسنگوں، جھانجھوں اور موسیقی کے تمام سازوں کی تائید نہیں کر رہا جیسا کہ ہم اوپر یہ بات ثابت کر چکے ہیں۔ جب قرآن کتاب مقدس کی ان آیات کی تائید نہیں کر رہا تو کتاب مقدس کی یہ آیات بھی محفوظ ثابت نہیں ہوئیں۔ جب کتاب مقدس کی یہ آیات محفوظ ثابت نہیں ہوئیں تو یہ بھی ثابت نہ ہوا کہ پیغمبروں کے دین میں موسیقی جائز رہی ہے لہذا غامدی صاحب کا دعوی باطل ہوا۔

اس اصول پر شرعی دلائل کی روشنی میں کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے ہم تمہیداً غامدی صاحب کی خدمت میں ان کے امام اور خود ان کی اپنی تحریروں کے حوالے سے کچھ گزارشات پیش کر رہے ہیں۔

## غامدی صاحب کا اصول مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی نظر میں:

سجدہ تعظیمی سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تحریر میں سے چند اقتباسات ہم یہاں نقل کئے دیتے ہیں:

'سوال یہ ہے کہ قرآن میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں یا بعض جگہ پچھلی شریعتوں کے جو حوالے آ گئے ہیں، کیا وہ مجرد اتنی بات سے کہ وہ قرآن میں مذکور ہیں، اس امت کے لئے شریعت کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں، یا اس امت کے لئے ان کے شریعت بننے کے لئے کچھ اور شرطیں بھی ہیں۔ میرا نقطہ نظر اس طرح کے تمام واقعات اور حوالوں سے متعلق یہ ہے کہ یہ مجرد قرآن میں مذکور ہو جانے کی وجہ سے امت محمدیہ کے لئے شریعت نہیں بن سکتے...قرآن میں حضرت آدم کے ایک بیٹے کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ جب ان کو ان کے بھائی نے قتل کرنے کی دھمکی دی تو انھوں نے کہا کہ میں تو تم پر قتل کے ارادے سے ہاتھ نہیں اٹھاوں گا، خواہ تم مجھے قتل ہی کر ڈالو،، میں تو اللہ رب العلمین سے ڈرتا ہوں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ انھوں نے اپنی بیٹی کا نکاح حضرت موسی علیہ السلام سے محض اس خدمت کے معاوضے میں کر دیا کہ وہ ایک خاص مدت تک ان کی بکریاں چرائیں۔ حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ ان کی قوم کے غنڈوں نے جب ان کے مہمان کی فضیحت کرنی چاہی تو انھوں نے ان کو مخاطب کر کے کہا اگر تمھیں کچھ کرنا ہے تو میری لڑکیوں کے ساتھ کرو، خدارا میرے مہمانوں کے بارے میں مجھے رسوا نہ کرو۔ حضرت سلیمان کے بارے میں ہے کہ ایک مرتبہ فوج کی پریڈ کے موقع پر ان کی نماز عصر قضاء ہو گئی تو انھوں نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر گھوڑوں ہی کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ سورہ کہف میں ایک نیک بندے کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ انھوں نے اس بنا پر ایک بچے کو قتل کر دیا تھا کہ انھیں یہ علم ہو گیا تھا کہ وہ بڑا ہو کر اپنے ماں باپ کا نافرمان ہوگا، اور ایک کشتی میں اس بنا پر سوراخ کر دیا کہ انھیں اندیشہ ہوا کہ اس دیار کا بادشاہ کہیں اس کشتی کو قبضے میں نہ کر لے۔ یہ اور اس طرح کے جو واقعات قرآن میں بیان ہوئے ہیں اور بطریق مذمت نہیں بیان ہوئے بلکہ بطریق مدح بیان ہوئے ہیں۔ اب بتایئے کہ کیا مجرد اس بنا پر کہ یہ واقعات قرآن میں بیان ہوئے ہیں یہ اس امت کے لئے قانون اور شریعت بن جائیں گے اور ایک شخص کے لئے یہ بات جائز ہو جائے گی کہ اگر وہ اپنے کشفی علم سے کسی بچے کے بارے میں یہ معلوم کر لے کہ یہ نافرمان اٹھے گا تو اسے قتل کر ڈالے یا کوئی شخص اس پر حملہ آور ہو تو اپنے آپ کو بے چون و چرا اس کے حوالے کر دے؟...ان ضمنی طور پر بیان شدہ واقعات سے اگر کوئی تعلیم نکلتی ہے

تو وہ اس امت کے لئے اس صورت میں ہدایت اور شریعت کا درجہ اختیار کر سکتی ہے، جب کتاب وسنت کی دوسری تصریحات سے بھی اس بات کی تائید ہو جائے کہ اس تعلیم کو اس امت کے اندر بھی باقی رکھنا شارع کو مطلوب ہے، یا کم از کم یہ کہ کوئی بات اس کے خلاف نہ پائی جائے لیکن اگر دوسری تصریحات اس کے خلاف ہوں تو اس کے صاف معنی یہ ہوں گے کہ اس امت میں اس تعلیم کو باقی رکھنا شارع کو مطلوب نہیں ہے اگر اس قسم کی کوئی تصریح خود قرآن میں ہو تو وہ تصریح اس اشارہ پر مقدم ہوگی...اور اگر یہ تصریح قرآن کے بجائے حدیث میں ہو تو بھی اس کو تقدم حاصل ہوگا...جو کچھ موجود ہے اس کی حیثیت محض ایک واقعہ کی ہے جو پچھلی امتوں میں سے کسی امت میں یا سابق انبیاء میں سے کسی نبی کی زندگی میں پیش آیا ہو۔سوال یہ ہے کہ اس امت میں یہ بات بعینہٖ اس شکل میں مطلوب ہے یا نہیں، تو اس کی وضاحت قرآن بھی کر سکتا ہے اور حدیث بھی کر سکتی ہے۔قرآن کے کسی واضح حکم کو منسوخ کرنے کے لئے تو بلاشبہ حدیث ناکافی ہے لیکن پچھلی امتوں یا سابق انبیاء میں سے کسی کی تعلیم کو یا کسی روایت کو منسوخ کرنے کے لئے تو حدیث بالکل کافی ہے بے شمار معاملات ہیں جن میں ہم جانتے ہیں کہ سابق انبیاء کی تعلیم کچھ اور تھی اور ہمارے نبی نے ہمیں اس کی جگہ کوئی اور ہدایت فرمائی اور ہم بے چون و چرا اس کو تسلیم کرتے ہیں، یہ عذر نہیں پیش کرتے کہ کسی سابق نبی کی تعلیم کو حدیث کس طرح منسوخ کر سکتی ہے'۔ (۱۲)

یہاں تک مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی عبارت ختم ہوئی۔اس عبارت سے درج ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱) کتاب مقدس کی وہ تعلیمات جو قرآن میں اشارتاً، اجمالاً یا تفصیلاً بیان ہوئی ہیں اس وقت تک ہمارے لئے دلیل نہیں بن سکتیں جب تک کہ خود قرآن یا حدیث سے ان تعلیمات کا اثبات نہ ہو۔گویا کہ اصل دلیل قرآن وسنت ہے نہ کہ سابقہ شرائع، جبکہ غامدی صاحب سابقہ شرائع کو مستقل طور پر مآخذ دین میں سے شمار کرتے ہیں اور ان سے بھی مسائل کا اثبات کرتے ہیں۔

۲) قرآن کے علاوہ اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث بھی کتب سابقہ کی تعلیمات کی منسوخی کے لئے کافی ہیں۔یعنی قرآن کی کسی آیت کی تفسیر یا اس کے علاوہ کسی مسئلے میں اگر کتاب مقدس اور احادیث میں اختلاف ہو جائے تو حجت احادیث ہوں گی۔جبکہ غامدی صاحب قرآن کی کسی آیت کی تفسیر میں احادیث کے بالمقابل کتاب مقدس کی آیات کو ترجیح دیتے ہیں، جیسا کہ بہت سارے معاملات میں ان کی آراء سے بھی ظاہر ہے۔

۳) بہت سارے احکامات جو پچھلی شریعتوں میں جائز تھے ہمارے لئے ان پر عمل کرنا یا ان سے اپنے عمل پر دلیل پکڑنا جائز نہیں۔جبکہ غامدی صاحب اس کے قائل نہیں ہیں کہ ایک فعل کسی شریعت میں جائز رہا ہو اور بعد میں اسے کسی دوسری شریعت میں شارع کی طرف سے ناجائز قرار دے دیا گیا ہو۔

## غامدی صاحب کا اصول 'میزان' کی نظر میں:

غامدی صاحب نے جس طرح سے موسیقی، یاجوج ماجوج اور تصویر وغیرہ کے مسئلے میں کتاب مقدس سے استدلال کیا ہے وہ خود ان کے اپنے اس اصول کے خلاف ہے جو انھوں نے اپنی کتاب 'میزان' میں بیان کیا ہے غامدی صاحب 'میزان' میں ایک جگہ تدبر قرآن کے اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'سوم یہ کہ الہامی لٹریچر کے خاص اسالیب، یہود و نصاریٰ کی تاریخ، انبیائے بنی اسرائیل کی سرگزشتوں اور اس طرح کے دوسرے موضوعات سے متعلق قرآن کے اسالیب واشارات کو سمجھنے اور اس کے اجمال کی تفصیل کے لئے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے'۔ (۱۳)

اس عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک قدیم صحائف کو یہود و نصاریٰ کے اخبار و واقعات اور قصص و تاریخ سے متعلقہ قرآنی آیات کو سمجھنے کے لئے مآخذ بنایا جائے گا نہ کہ احکام وعقائد کے لئے، یہ نہایت موزوں موقع تھا کہ غامدی صاحب اس مسئلے پر اصولی بحث کرتے ہوئے اپنی اس عبارت میں احکام اور عقائد کا بھی تذکرہ کر دیتے لیکن ان کا یہاں پر احکام وعقائد کا تذکرہ نہ کرنا اور، کہیں اور جا کر احکام اور عقائد سے متعلقہ مسائل کے لئے قدیم صحائف کو بنیاد بنانا ذہن میں کچھ سوالات ضرور پیدا کرتا ہے۔یہ بات بالکل واضح ہے کہ موسیقی اور تصویر کا تعلق احکام سے ہے اور یاجوج ماجوج کا تعین عقیدے کا مسئلہ ہے۔عقیدے اور احکام کے بارے میں غامدی صاحب کے ہاں ایک انتہا تو یہ ہے کہ خبر واحد سے تو کسی بھی حکم اور عقیدے کو ثابت نہیں کیا جا سکتا لیکن دوسری طرف تحریف شدہ کتاب مقدس سے وہ کس سہولت و آسانی سے احکام وعقائد کا اثبات کر رہے ہیں یہ بالکل ظاہر باہر ہے۔غامدی صاحب کے نزدیک حدیث سے کوئی نیا حکم یا عقیدہ تو ثابت نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ

قرآن میں موجود کسی حکم یا عقیدے کی تفہیم وتبیین میں دلیل بن سکتی ہے جبکہ یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ غامدی صاحب کتاب مقدس سے ایک نئے حکم (موسیقی کا جواز) کو ثابت کر رہے ہیں کیونکہ بقول ان کے، قرآن کے الفاظ میں اس مسئلہ کی حلت وحرمت کے بارے میں کوئی یقینی حکم نہیں ہے۔ گویا کہ غامدی صاحب کے نزدیک کتاب مقدس صرف قرآنی آیات واحکام کی تفہیم وتبیین ہی نہیں کرتی بلکہ اس سے نئے احکام کا اثبات بھی کیا جاسکتا ہے۔

## غامدی صاحب کا اصول دلائل شرعیہ کی روشنی میں:

اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت کے بعد امت محمدیہؐ نہ تو سابقہ شرائع کی متعبد ہے اور نہ ہی سابقہ امم کی کتابیں ہمارے لئے مآ خذ دین کا درجہ رکھتی ہیں۔ ہمارے اس دعوی کے درج ذیل دلائل ہیں۔

## پہلی دلیل:

اللہ کے رسول ﷺ نے جب حضرت معاذؓ کو یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا تو فرمایا:

**کیف تقضی اذا عرض لك قضاء قال: اقضی بکتاب الله، قال: فان لم تجد فی کتاب الله، قال: فبسنة رسول الله، قال: فان لم تجد فی سنة رسول الله و لا فی کتاب الله، قال: اجتهد رائی** (١٤)

اگر تمہیں کوئی مسئلہ درپیش ہوگا تو کیسے فیصلہ کرو گے تو حضرت معاذؓ نے جواب دیا میں قرآن سے فیصلہ کروں گا، آپؐ نے فرمایا اگر تمہیں قرآن میں نہ ملے۔ تو حضرت معاذؓ نے کہا اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے۔ پھر آپؐ نے فرمایا اگر وہ مسئلہ نہ قرآن میں ملے اور نہ سنت رسول میں، تو حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔

اس روایت میں حضرت معاذؓ نے پچھلے انبیاء اور ان کی تعلیمات کا بالکل بھی تذکرہ نہ کیا اگر سابقہ کتب سماویہ بھی مآ خذ دین میں سے ہوتیں تو اللہ کے رسول ﷺ ان کو ان کتب کی طرف بھی رجوع کا حکم دیتے۔ لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے اس قول کو صحیح قرار دیتے ہوئے ان کے لئے دعا کی۔ واضح رہے کہ اس روایت کی صحت وضعف کے بارے میں اگرچہ محدثین کا اختلاف ہے لیکن اس کی تائید بہت سے شواہد وآثار سے بھی ہوتی ہے، جس سے یہ روایت حسن کے درجے کو پہنچ جاتی ہے۔

## دوسری دلیل:

قاضی شریح نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں ان کو ایک خط لکھا جس میں قضاء کے بارے میں حضرت عمرؓ سے رہنمائی حاصل چاہی تو حضرت عمر نے ان کو جواباً یہ خط لکھا:

**ان اقض بما فی کتاب الله فا ن لم یکن فی کتاب الله فبسنة رسول الله فان لم یکن فی کتاب الله و لا فی سنة رسول الله فاقض بما قضی به الصالحون فان لم یکن فی کتاب الله و لا فی سنة رسول الله ولم یقض به الصالحون فان شئت فتقدم و ان شئت فتاخر و لا اری التاخر الا خیر لك و السلام علیکم**(١٥)

تم اللہ کی کتاب قرآن کے ساتھ (لوگوں کے درمیان) فیصلہ کرو، اگر کتاب اللہ میں وہ مسئلہ موجود نہ ہو تو اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کے ساتھ فیصلہ کرو، اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں بھی نہ ہو اور سنت رسول ﷺ میں بھی نہ ہو تو نیک لوگوں کے فیصلوں کو سامنے رکھو، پس اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں بھی نہ ہو اور سنت رسول ﷺ میں بھی نہ ہو اور نیک لوگوں نے بھی اس کے بارے میں کوئی رائے نہ دی ہو تو اب اگر تم چاہو تو آگے بڑھو (یعنی خود اجتہاد کرو) اور اگر تم چاہو تو رکے رہو (یعنی اپنے اجتہاد سے فیصلہ نہ کرو) لیکن میرے خیال میں تمہارا رکا رہنا تمہارے حق میں بہتر ہے اور تمہارے اوپر اللہ کی سلامتی ہو۔

یہ روایت صحیح ہے علامہ البانی نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔

## تیسری دلیل؛

اگر پچھلی شریعتیں بھی مآ خذ دین میں سے ہوتیں تو ان کا سیکھنا فرض کفایہ ہوتا اور اللہ کے رسول ﷺ خود بھی تورات وانجیل کی تعلیم حاصل کرتے اور صحابہ کرامؓ کو بھی کتاب مقدس کی تعلیم دیتے۔ جبکہ ہمارے علم میں ہے کہ نہ تو اللہ کے رسول ﷺ نے خود سابقہ کتب کا مطالعہ کیا اور نہ صحابہ نے ان کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی، حالانکہ کہ آپ

اورصحابہؓ کے پاس عبداللہ بن سلامؓ کعب الاحبار اور وھب بن منبہ کی صورت میں اس کے مواقع بھی موجود تھے۔

## چوتھی دلیل :

اس بات پر علماء امت کا اجماع ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے آ کر پچھلی شریعتوں کو منسوخ کر دیا[۱۶]۔اگر استثناء ہے بھی تو محض عقائد،اخلاقیات اور چند بنیادی مخصوص احکامات کا،کہ جن کو ہماری شریعت نے بھی برقرار رکھا ہے۔اس لئے پچھلی شریعتوں سے عمومی طور پر دلیل پکڑنا صحیح نہیں ہے۔

## پانچویں دلیل:

حضرت جابر سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

**اعطیت خمسا لم یعطھن احد قبلی نصرت بالرعب مسیرۃ شھر و جعلت لی الارض مسجداوطھورا فایما رجل من امتی ادرکتہ الصلاۃ فلیصل و احلت لی الغنائم ولم تحل لاحد قبلی واعطیت الشفاعۃ وکان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ و بعثت الی الناس عامۃ**[۱۷]

''مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں کہ مجھ سے پہلے وہ کسی (نبی) کو نہ دی گئیں،پہلی بات یہ ہے کہ ایک مہینے کی مسافت تک دشمنوں پر میرا رعب ڈال دیا گیا دوسری بات یہ کہ تمام زمین کو میرے لئے مسجد اور پاک بنا دیا گیا پس اگر میری امت میں کسی کو بھی نماز (کا وقت کہیں بھی) پالے تو وہ (اسی جگہ) نماز ادا کرلے۔تیسری بات یہ کہ میرے لئے مال غنیمت کو حلال کر دیا گیا۔چوتھی بات یہ کہ مجھے مقام شفاعت عطا کیا گیا۔اور پانچویں بات یہ کہ مجھ سے پہلے انبیاء کوایک خاص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور مجھے تمام نوع انسانی کے نبی بنا کر بھیجا گیا''۔

اللہ کے رسول ﷺ کے یہ الفاظ'و **کان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ** 'اس مسئلے میں قطعی حجت ہیں کہ سابقہ شرائع مخصوص اقوام کے لئے تھیں جبکہ'و **بعثت الی الناس عامۃ**' کے الفاظ سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ آپ کی ہی شریعت وہ اکیلی شریعت ہے جو قیامت تک کے انسانوں کے لئے رہنمائی اور ہدایت کی صلاحیت رکھتی ہے۔

## چھٹی دلیل:

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے:

**کان اھل الکتاب یقرؤن التوراۃ بالعبرانیۃویفسرونھابالعربیۃلاھل الاسلام فقال رسول اللہ ﷺ لا تصدقوا اھل الکتاب و لا تکذبوھم و قولوا (امنا باللہ و ما انزل الینا)الآیۃ**[۱۸]

اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور مسلمانوں کے لئے عربی زبان میں اس کی تفسیر کرتے تھے تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:نہ تو اہل کتاب کی تصدیق کرو اور نہ ان کی تکذیب کرو اور یہ بات کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا۔

اللہ کے رسول ﷺ کی طرف تو وحی آتی تھی اور آپؐ وحی کی روشنی میں اپنے صحابہؓ کو بتا سکتے تھے کہ تورات کی یہ آیات محفوظ ہیں یا نہیں اور تورات کی محفوظ آیات سے استدلال بھی کر سکتے تھے،لیکن آپؐ نے نہ تو بذات خود تورات کی آیات کی تصدیق کی اور نہ ہی صحابہؓ کو اس کی اجازت دی چہ جائیکہ آپؐ اس سے کسی مسئلے میں استدلال کرتے۔

## ساتویں دلیل:

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

**بلغوا عنی ولو آیۃ وحدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج ومن کذب علی متعمدافلیتبوامقعدہ من النار**[۱۹]

میری طرف سے پہنچاؤ چاہے وہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو اور بنی اسرائیل سے روایت کرلیا کرو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور جس نے جان بوجھ کر میرے اوپر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

'ولا حرج' کے الفاظ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل سے روایت کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ مباح ہے۔ایک ایسی چیز کہ جس سے نقل کرنے کی رخصت دی گئی ہو وہ

ہمارے لئے شریعت کیسے ہوسکتی ہے؟ جو چیز شریعت ہے اس سے استدلال واجب ہے جیسے کہ قرآن وسنت ہیں۔ جبکہ سابقہ کتب سے رہنمائی کو واجب قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس کی رخصت دی گئی ہے اور یہ رخصت بھی راجح قول کے مطابق صرف واقعات کی حد تک ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اجازت دینے کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی جاری فرمادی کہ اہل کتاب کی باتیں سن لینے میں اور بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن ان کی باتوں کی تصدیق یا تکذیب نہ کرو۔ اس حدیث کے مطابق بنی اسرائیل سے متعلقہ قرآنی اخبار وقصص کی تکمیل کے لئے کتاب مقدس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے لیکن ان واقعات میں بھی بہت کچھ جھوٹ کی آمیزش ہو چکی ہے جس کی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ نے اہل کتاب سے نقل کرنے کی اجازت تو دے دی لیکن اس کی تصدیق وتکذیب سے روک دیا۔

## آٹھویں دلیل:

حضرت عبیداللہ بن عبداللہ حضرت ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

**كيف تسألون أهل الكتاب عن شيء و كتابكم الذى أنزل على رسول الله أحدث تقرؤونه محضا لم يشب قد حدثكم أن أهل الكتاب بدلوا كتا ب الله و غيروه و كتبوا بأيديهم الكتاب و قالوا هو من عند الله ليشتروا به ثمنا قليلا ألا ينهاكم ما جائكم من العلم عن مسألتهم لا والله ما رأينا منهم رجلا يسألكم عن الذى أنزل عليكم** (۲۰)

کیسے تم اہل کتاب سے کسی مسئلے کے بارے میں پوچھتے ہو حالانکہ تمہاری کتاب جو کہ اللہ کے رسول ﷺ پر نازل کی گئی زیادہ نئی ہے تم اس کو خالص حالت میں پڑھتے ہو اور اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں کی گئی۔ جبکہ اہل کتاب نے اللہ کی کتاب کو بدل ڈالا ہے اور اس کو تبدیل کر دیا ہے اور اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھی ہے اور اس کے بعد یہ دعوی کیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تا کہ وہ اس کے بدلے میں کچھ قیمت حاصل کر سکیں۔ خبردار! جو علم (قرآن وسنت) تمہارے پاس آیا ہے وہ تمہیں اہل کتاب سے سوال کرنے سے منع کرتا ہے۔ نہیں اللہ کی قسم ہم نے اہل کتاب میں سے کسی آدمی کو نہیں دیکھا کہ جو تم سے اس (قرآن وسنت) بارے میں سوال کرے جو کہ تم پر نازل کیا گیا ہے۔

اگر کوئی اس حدیث کی تشریح میں یہ بات کہے کہ اہل کتاب سے کوئی مسئلہ دریافت کرنے سے منع کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ سابقہ کتب محفوظ نہیں اگر وہ محفوظ ثابت ہو جائیں تو ان سے رہنمائی لی جاسکتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ استدلال غلط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ اور صحابہ کرام کے لئے سابقہ کتب کی تعلیمات کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ وہ محفوظ ہیں یا نہیں چنداں مشکل نہ تھا۔ صحابہ کرام اللہ کے رسول ﷺ سے پوچھ سکتے تھے جبکہ اللہ کے رسول ﷺ کو وحی کے ذریعے معلوم ہوسکتا تھا کہ یہ تعلیم محفوظ ہے اور اس میں تحریف ہو چکی ہے۔ لیکن صحابہ کرام اور آپ کا سابقہ کتب کی تعلیمات سے عدم تعرض اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سابقہ کتب سے استدلال نہ کرنے کا جو حکم ہے اس کی اصل علت شریعت محمدیہ کا کامل واکمل ہونا ہے جو کہ انتہائی درجے اتمام اور اکمال کی وجہ سابقہ شرائع کی کسی طور بھی محتاج نہیں ہے۔

## نویں دلیل:

حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

**لا تسألوا أهل الكتاب عن شيء فانهم لن يهدوكم و قد ضلوا فانكم اما أن تصدقوا بباطل أو تكذبوا بحق لو كان موسى حيا بين أظهركم ما حل له الاأن يتبعني** (۲۱)

اہل کتاب سے کچھ بھی نہ پوچھو بے شک وہ تمہاری رہنمائی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ خود گمراہ ہو چکے ہیں ان سے مسئلہ پوچھ کر یا تو تم کسی باطل چیز کی تصدیق کر بیٹھو گے یا کسی حق بات کو جھٹلاؤ گے (یادرکھو) اگر حضرت موسی بھی تمہارے درمیان موجود ہوتے تو ان کے لئے بھی سوائے میری اتباع کوئی چارہ کار نہ تھا۔

اصول فقہ کا یہ قاعدہ ہے کہ جب نفی یا نہی کے سیاق میں نکرہ آئے تو نص میں عموم پیدا ہو جاتا ہے لہذا ''عن شیء'' میں ہر چیز داخل ہے۔ یعنی سابقہ شرائع کسی مسئلے میں بھی رہنمائی کے قابل نہیں ہیں چاہے وہ مسئلہ عقائد سے متعلق ہو یا احکام سے یا اخبار وقصص سے، کسی حد تک قرآن وسنت کے سیاق وسباق کی تعیین کے لئے اسرائیلی اخبار و قصص کے نقل کرنے کی جو رخصت دی گئی ہے اس میں بھی اصل مطلوب ان کتب میں بیان شدہ واقعات سے رہنمائی حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اصل مقصد قرآن وسنت میں وارد شدہ واقعات کے صحیح مفہوم تک رسائی حاصل کرنا ہے۔

## دسویں دلیل:

آج یہ بات تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ اپنے زمانے میں صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے نہ کہ اس وقت کی پوری دنیا کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ یہاں پرسوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں مصر وفلسطین کے علاوہ بھی دنیا تھی جہاں لوگ آباد تھے ان کے لئے شریعت کون سی تھی؟ان کی طرف کس نبی کو بھیجا گیا تھا؟ کیا حضرت موسیٰ اپنے وقت میں ساری دنیا کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے؟ یقیناً اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث اور تاریخ اس چیز کی نفی کرتی ہے کہ حضرت موسی ساری دنیا کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے جب حضرت موسی کی شریعت اپنے زمانے میں موجود تمام انسانوں کے لئے حجت نہ تھی تو صدیوں بعد آنے والی امت محمدیہ کے لئے کیسے دلیل بن سکتی ہے۔

## گیارھویں دلیل:

ایک حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

**وعن جابرؓ عن النبی ﷺ حین اتاہ عمر فقال انا نسمع احادیث من یهود تعجبنا ا فتری ان نکتب بعضها ؟ فقال ا متهوکون انتم کما تهوکت الیهود و النصاری ؟قد جئتکم بها بیضاء نقیة و لو کان موسی حیا ماوسعه الا اتباعی** (۲۲)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ آپ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ آپ کے پاس آئے تو انھوں نے آپ سے کہا کہ ہم یہود سے بہت ساری ایسی باتیں سنتے ہیں جو کہ ہمیں اچھی لگتی ہیں آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے اگر ہم ان میں سے بعض باتوں کو لکھ لیں۔تو آپؐ نے فرمایا کیا تم بھی اہل یہود کی طرح ہلاک ہونا چاہتے ہو! میں تمھارے پاس ایسی واضح اور روشن آیات لے کر آیا ہوں کہ اگر حضرت موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو ان کے لئے بھی میری اتباع کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔علامہ البانی نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔

ایک اور طویل روایت کے الفاظ یہ ہیں

**و لو کان حیا و ادرك نبوتی لا تبعنی** (۲۳)

اور اگر حضرت موسی زندہ ہوتے اور میری نبوت کو پالیتے تو لازما میری اتباع کرتے۔

بعض روایات میں الفاظ ہیں

**لو کان موسی و عیسی حیین لما و سعهما الا اتباعی** (۲٤)

اگر موسیٰ اور عیسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے لئے بھی میری اتباع کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

ان احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پچھلی ساری شریعتیں منسوخ ہیں۔اور اگر وہ محفوظ ثابت ہو بھی جائیں تو پھر بھی ان پر عمل نہ ہوگا،جیسا کہ غامدی صاحب کا اصول ہے کہ کتاب مقدس کی آیات کو پہلے محفوظ ثابت کرتے ہیں اور پھر ان سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ صاحب تورات (حضرت موسی) اور صاحب انجیل (حضرت عیسی) کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر وہ بھی زندہ ہوتے تو آپ ہی کی شریعت کی اتباع کرتے ،اور تورات اور انجیل کو حضرت موسیٰ اور عیسیٰ سے زیادہ کون جانتا ہوگا ؟جب ان انبیاء کے بارے میں فرمادیا گیا کہ جن پر یہ کتابیں نازل ہوئیں وہ بھی اگر آپ کے زمانے کو پالیں تو انھیں بھی اپنی کتابوں کی بجائے آپ کی اتباع کرنی ہوگی حالانکہ اس صورت حال میں تو ،تورات وانجیل بعینہ اپنی اصل شکل میں محفوظ ہو جاتیں ہیں۔حضرت موسیٰ اور عیسیٰ اگر زندہ ہوتے تو ان کے لئے تورات وانجیل ایسے ہی محفوظ ہوتی جیسے ہمارے لئے قرآن، کیونکہ ان سے زیادہ تورات وانجیل کو کون جانتا ہوگا لیکن اس کے باوجود ان کے بارے میں کہا گیا کہ وہ آپ کے ایک امتی ہی کی حیثیت سے اس امت میں زندگی گزارتے۔اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ جب اس دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے تو آپؐ کے امتی ہی کی حیثیت سے آئیں گے اور آپؐ ہی کی لائی گئی شریعت کے پیرو ہوں گے نہ کہ تورات وانجیل کے۔مسلم کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

**و عن جابر قال قال رسول الله ﷺ لا تزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاهرین الی یوم القیامة قال فینزل عیسی بن مریم فیقول امیرهم تعال صل لنا فیقول لا ان بعضکم علی بعض امراء تکرمة الله هذه الامة**(۲۵)

اورحضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میری امت میں سے ایک گروہ قیامت تک حق کے لئے لڑتا رہے گا اور (اپنے دشمنوں پر) قیامت (کے قریب) تک غالب رہے گا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کا نزول ہوتو ان کا امیر حضرت عیسیٰؑ سے کہے گا آئیں ہمارے لئے امامت کرائیں تو حضرت عیسیٰؑ انکار کریں گے اور فرمائیں گے کہ تم میں بعض، بعض کا امیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عزت بخشی ہے (کہ ان کا امیر انہی میں سے ہو)

بارہویں دلیل: علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں آیہ مبارکہ:

**﴿و اذ اخذ الله میثاق النبیین لما اتیتکم من کتب و حکمة ثم جاء کم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن به و لتنصرنه﴾**(۲۶)

کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت علیؓ کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان فقہائے صحابہ کے نزدیک اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام انبیاء سے یہ وعدہ لیا تھا کہ اگر ان میں سے کسی ایک کی زندگی میں آپؐ مبعوث ہو جائیں تو وہ آپؐ پر لازماً ایمان لے آئیں گے اور آپؐ کی مدد کریں گیا اور اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو یہ بھی حکم دیا کہ وہ اپنی امت سے بھی یہ پختہ وعدہ لیں کہ اگر ان کی موجودگی میں آپؐ کا ظہور ہو جائے تو وہ آپؐ پر ایمان لے آئیں گے۔

انبیاء سے آپؐ پر ایمان لانے کا جو مطالبہ کیا گیا ہے اس سے یہ بات خوب اچھی طرح واضح ہو رہی ہے کہ آپؐ کی آمد کے بعد کسی نبی کو بھی اپنی شریعت پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی چہ جائیکہ کسی امتی کو آپ کی بعثت کے بعد یہ اجازت دی جائے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ آخری نبی کی لائی ہوئی شریعت کو اتنا جامع اور مکمل ہونا تھا کہ وہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے رہنمائی بن سکے جبکہ باقی انبیاء کو ان کے خاص دور، علاقے اور قوم کی مناسبت سے شریعتیں دی گئی تھیں۔

فصل چہارم:

# اہل سنت اور سابقہ کتب سماویہ

اصولیین نے اصول فقہ کی کتابوں میں 'شرائع من قبلنا ' کےعنوان کے تحت یہ بحث کی ہے کہ کیا سابقہ شرائع ادلہ تشریع میں سے ہیں یا نہیں؟ یعنی کیا 'شرائع من قبلنا' امت مسلمہ کے لئے مآ خذ شریعت کی حیثیت رکھتی ہیں یا نہیں؟ اس ساری بحث کا خلاصہ کلام یہی ہے کہ سابقہ شرائع کے وہ احکامات جو کہ ہماری شریعت میں ثابت یا مذکور ہوں ہمارے حق میں حجت بن سکتے ہیں۔

اول الذکر کے بارے میں تو کسی کا اختلاف نہیں ہے یعنی جو حکم پچھلی شریعتوں میں ثابت ہو اور ہماری شریعت نے بھی اس کا بطور حکم اثبات کیا ہو تو اس پر عمل کرنا ہمارے لئے مشروع ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہماری شریعت نے اس حکم کا اثبات کیا ہے اور اس کو ہمارے حق میں برقرار رکھا ہے۔

جہاں تک مؤخر الذکر کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ ایسے احکامات جو پچھلی شریعتوں میں تو بطور حکم موجود تھے لیکن ہماری شریعت یعنی قرآن وسنت میں ان کا تذکرہ بطور خبر کے ہوا ہے کیا ایسے احکامات ہمارے حق میں حجت ہیں یا نہیں؟ بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ پچھلی شریعتوں کے ایسے احکامات جو قرآن و سنت میں خبر کے انداز میں بیان ہوئے ہیں، شارع کا ہماری شریعت یعنی قرآن وسنت میں ان احکامات کو بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہمارے حق میں بھی مشروع ہیں جبکہ جمہور فقہاء کا موقف یہ ہے کہ ایسے احکامات کا ہماری شریعت میں صرف بیان کر دینا ہی کافی نہیں ہے جب تک کہ اس بات کی کوئی واضح دلیل نہ مل جائے کہ ان احکامات کو ہمارے حق میں باقی رکھنا شارع کا مقصود ہے، اور یہی مسلک دلائل کی روشنی میں راجح ہے۔ علمائے اصول نے اس بحث کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:

## پہلی قسم:

ایسے احکامات جو پچھلی شریعتوں میں موجود ہیں اور ہماری شریعت نے آ کر ان کو منسوخ کر دیا ہے ان کے بارے میں فقہاء کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ان پر عمل کرنا ہمارے لئے جائز نہیں ہے مثلاً سجدہ تعظیمی کرنا

## دوسری قسم:

ایسے احکامات جن کا ذکر ہماری شریعت یعنی کتاب وسنت میں نہیں ہے لیکن پچھلی شریعتوں میں ہمیں ان کا تذکرہ ملتا ہے احکامات کی اس قسم کے بارے میں بھی فقہاء کا اتفاق ہے کہ ایسے احکامات ہمارے لئے کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتے۔

## تیسری قسم:

ایسے احکامات جن کا تذکرہ پچھلی شریعتوں میں ملتا ہے اور ہماری شریعت میں بھی یہ احکام موجود ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری شریعت میں اس بات کی دلیل بھی ملتی ہے کہ یہ احکامات اسی طرح ہمارے لئے فرض ہیں جیسے کہ پہلی امتوں کے لئے فرض تھے مثلاً روزہ رکھنا...وغیرہ۔ ان احکامات پر عمل کرنا ہمارے حق میں حجت ہے اور اس میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے لیکن ان احکامات پر ہم اس وجہ سے عمل کرتے ہیں کہ ہماری شریعت نے ان کو ہمارے لئے فرض قرار دیا ہے۔ اس قسم کے احکامات کے بارے میں ڈاکٹر عبدالکریم زیدان فرماتے ہیں

و هذا النوع من الاحکام لا خلاف فی انه شرع لنا ، و مصدر شرعیته و حجیته بالنسبة الینا هو نفس نصوص شریعتنا(۴)

اس قسم کے احکامات بغیر کسی اختلاف کے ہمارے لئے شریعت ہیں لیکن ان کا ہمارے حق میں شریعت اور حجت ہونا اس وجہ سے ہے کہ یہ ہماری شریعت کی نصوص سے ثابت ہیں۔

## چوتھی قسم:

پچھلی شریعتوں کے وہ احکامات جن کا صرف تذکرہ ہماری شریعت میں ملتا ہے لیکن ہماری شریعت میں کوئی ایسی دلیل نہ ہو جو کہ اس بات کی طرف رہنمائی کرے کہ یہ

احکامات ہمارے حق میں ثابت ہیں یا نہیں، احکامات کی اس قسم کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں:

الف) اکثر علمائے احناف اور مالکیہ کے نزدیک یہ احکامات ہمارے لئے حجت ہیں کیونکہ ان فقہاء کے نزدیک ان احکامات کا ہماری شریعت میں مذکور ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ شارع نے ان احکامات کو ہمارے حق میں برقرار رکھا ہے۔

ب) شوافع، حنابلہ، اشاعرہ، معتزلہ اور شیعہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ احکامات ہمارے حق میں حجت نہیں ہیں اور اس قول کو امام غزالی، امام رازی، علامہ آمدی، علامہ ابن حزم اور متاخرین علمائے اصول نے پسند کیا ہے اور اسی موقف کو جناب غامدی صاحب کے امام امین احسن اصلاحی صاحب نے اختیار کیا۔

ج) بعض اصولیین مثلاً ابن برھان اور ابن قشیری کا کہنا یہ ہے کہ اس بارے میں توقف کیا جائے گا۔

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان اصولیین کے اس اختلاف کے بارے میں فرماتے ہیں:

**و الحق ان هذا الخلاف غير مهم ، لانه لا يترتب عليه اختلاف في العمل ، فما من حكم من احكام الشرائع السابقه ، قصه الله علينا، او بينه الرسول لنا، الا و في شريعتنا ما يدل على نسخه او بقائه في حقنا سواء جاء دليل الابقاء او النسخ في سياق النص الذى حكى لنا حكم الشرائع السابقه ، او جاء ذلك الدليل في مكان آخر من نصوص الكتاب و السنة** (۴۲)

اور حق بات تو یہ ہے کہ یہ اختلاف اتنا اہم نہیں ہے، کیونکہ عملی طور پر اس مسئلے میں کوئی اختلاف مرتب نہیں ہوتا، کیونکہ پچھلی شریعتوں کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے قرآن میں بیان کیا ہو یا اللہ کے رسول ﷺ نے اس کو واضح کیا ہو اور ہماری شریعت میں کوئی نہ کوئی ایسی دلیل مل جاتی ہے جو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ وہ حکم ہمارے حق میں منسوخ ہے یا باقی ہے، اور بعض اوقات اس حکم کو باقی رکھنے یا منسوخ کرنے کی دلیل ساتھ ہی مذکور ہوتی ہے اور بعض اوقات کتاب و سنت کی نصوص میں کسی اور جگہ اس کا تذکرہ ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے حقیقت یہی ہے کہ اصولیین کا یہ اختلاف صرف لفظی ہے کیونکہ کوئی بھی ایسا حکم نہیں ہے جو کہ سابقہ شرائع کے حوالے سے کتاب و سنت میں بیان ہوا ہو اور اس کے منسوخ ہونے یا باقی رکھنے کی کوئی صراحت نصوص قرآن و سنت میں وارد نہ ہوئی ہو۔ لہٰذا اس مسئلے میں فقہاء کی کوئی سی بھی رائے اختیار کر لی جائے ہر صورت میں ہمارے لئے مآخذ و مصدر قرآن و سنت ہی بنتے ہیں نہ کہ کتاب مقدس، جیسا کہ غامدی صاحب کا خیال ہے۔

## پانچویں قسم:

'**شرائع من قبلنا**' سے استدلال کے اعتبار سے پانچویں قسم وہ ہے جس کو ہم غامدی صاحب کے حوالے سے سطور بالا میں بیان کر چکے ہیں۔ غامدی صاحب کے نزدیک کتاب مقدس کے احکامات امت مسلمہ کے لئے بھی اسی طرح شریعت کا درجہ رکھتے ہیں جس طرح پچھلی امتوں کے لئے' بشرطیکہ وہ قرآنی مندرجات سے محفوظ ثابت ہو جائیں اور قرآنی مندرجات سے ان کی مراد قرآن کے الفاظ، اشارات، اور اجمالی بیانات وغیرہ ہیں' ہمارے علم کی حد تک غامدی صاحب اپنے اس بیان میں منفرد ہیں۔ سلف صالحین میں سے کسی نے بھی یہ قسم بیان نہیں کی جو کہ غامدی صاحب بیان کر رہے ہیں۔

### خلاصہ کلام:

اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت اور قرآن مجید کے نزول کے بعد امت مسلمہ کے لئے اصل مآخذ و مصادر قرآن و سنت ہی ہیں۔ سابقہ کتب سماویہ اپنے اپنے ادوار میں اپنی قوموں کے لئے ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ تھیں۔ کتاب مقدس قانون سازی میں ہمارے لئے ماخذ و مصدر کی حیثیت نہیں رکھتی۔ ہاں اس حد تک کہنا ٹھیک ہے کہ '**حدثوا عن بنی اسرائیل و لا حرج**' جیسی تعلیمات کے مصداق کے طور پر' قوم بنی اسرائیل سے متعلقہ قرآنی واقعات اخبار و قصص کی تکمیل کے لئے' ہم کتاب مقدس کی عبارات سے استفادہ کر سکتے ہیں لیکن کسی قرآنی واقعے کی تکمیل کے لئے کتاب مقدس سے کیے جانے والے اس استفادے کی بنا پر کوئی حتمی رائے قائم کر لینا '**لا تصدقوا اهل الکتاب و لا تکذبوهم**' کے منافی ہے۔ جہاں تک احکام میں کتاب مقدس سے استدلال کرنے کا معاملہ ہے تو اس کی کوئی دلیل نقل و عقل میں نہیں ملتی۔

## باب سوم کے حوالہ جات:


۱۔ماہنامہ اشراق: مارچ ۲۰۰۴،ص ۱۱

۲۔أیضا،ص ۱۶

۳۔أیضا،ص ۱۸

۴۔أیضا،ص ۱۷

۵۔أیضا،ص ۱۲

۶۔ماہنامہ اشراق: جون ۲۰۰۰،ص ۳۴

۷۔أیضا

۸۔ماہنامہ اشراق: جنوری ۱۹۹۶،ص ۶۱

۹۔ماہنامہ اشراق: اکتوبر ۱۹۹۰،ص ۵

۱۰۔أیضا

۱۱۔ماہنامہ اشراق: مارچ ۲۰۰۴،ص ۱۶

۱۲۔ماہنامہ اشراق: نومبر ۱۹۸۹،ص ۳۶ تا ۳۸

۱۳۔میزان، جاوید احمد غامدی،ص ۵۲

۱۴۔سنن أبی داؤد، کتاب الأقضیۃ، باب اجتہاد الرأی فی القضاء

۱۵۔سنن نسائی، کتاب آداب القضاۃ، باب الحکم باتفاق اھل العلم

۱۶۔الاحکام فی أصول الأحکام، علامہ آمدی، جلد ۴،ص ۱۹۰

۱۷۔صحیح بخاری، کتاب التیمم، باب ''قول اللہ تعالی فلم تجدوا ماء فتیمموا''

۱۸۔صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب ''قولوا آمنا باللہ وما انزل الینا

۱۹۔سنن ترمذی، کتاب العلم عن رسول اللہ، باب ماجاء فی الحدیث عن بنی اسرائیل

۲۰۔صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب قول النبی لاتسأ لوا اھل الکتاب عن شیء

۲۱۔مسند أحمد: ۱۴۱۰۴

۲۲۔المشکوۃ: ۱۹۴

۲۳۔المشکوۃ: ۱۷۷

۲۴۔تفسیر ابن کثیر، علامہ ابن کثیر، سورۃ آل عمران: ۸۱

۲۵۔المشکوۃ: ۵۵۰۷، علامہ البانی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے

۲۶۔آل عمران: ۸۱

۲۷۔ماہنامہ اشراق: جنوری ۱۹۹۶،ص ۶۰ تا ۶۱

۲۸۔النساء: ۱۵۷ تا ۱۵۹

۲۹۔متی: باب۲۴،آیات۳ تا ۵

۳۰۔مرقس: باب۱۳،آیات۳ تا۶

۳۱۔لوقا: باب۲۱،آیات ۷تا۹

۳۲۔ تیمتھیس: باب۳،آیات۱۴تا ۱۵

۳۳۔استثناء: باب۲۲،آیات۲۲ تا۲۴،۲۸ تا۲۹

۳۴۔صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الزنا

۳۵۔ماہنامہ اشراق: جنوری۱۹۹۶،ص۶۱

۳۶۔ تھسلنیکیوں: باب۲،آیات۳ تا ۱۰

۳۷۔صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب کیف یعرض السلام علی الصبی

۳۸۔سنن ترمذی، کتاب الفتن، باب ماجاء فی قتل عیسی ابن مریم الدجال

۳۹۔متی: باب۲۴،آیات۲۳ تا۲۴

۴۰۔صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب فی صفة الدجال

۴۱۔الوجیز، ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، ص۲۶۳

۴۲۔الوجیز، ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، ص۲۶۵